بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان صفدرؒ

ماہنامہ الشریعہ

گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس و مدیر
حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

مدیر منتظم
ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۵ ۔ شمارہ ۱۱ ۔ نومبر ۲۰۲۴ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل ۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبد الغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

چھبیسویں دستوری ترمیم اور دینی حلقوں کے مطالبات 4
مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

آئینِ پاکستان کی ترامیم 8
معظم خان لودھی

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۱۱۸) 14
ڈاکٹر محی الدین غازی

انسانیت کے اخلاقِ اربعہ (۲) 21
شیخ التفسیر مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

مروياتِ منافقین کی تحقیق: استفسار و جواب 24
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

بچوں سے قرآن حفظ کرانا 26
ڈاکٹر عرفان شہزاد

اسرائیل کا لبنان پر حملہ 36
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تیسری عالمی جنگ کے آثار 45
عطیہ منور

دریائے نیل سے نہرِ فرات تک پھیلے ’گریٹر اسرائیل‘ کا تصور صرف ’شدت پسندوں کا خواب‘ ہے 47
یا کوئی ٹھوس منصوبہ؟
منزہ انوار

فلسطین کا ایک سال..52
روزنامہ جنگ

ڈاکٹر ذاکر عبد الکریم نائیک کی ملاقاتیں..53
قومی میڈیا

”سلاطینِ ہند کی دینی و مذہبی مساعی“...57
محمد عرفان ندیم

سلاطینِ ہند کی دینی و مذہبی مساعی از شمیم اختر قاسمی...60
پروفیسر عاصم منیر

یادِ حیات (۱): خاندانی پس منظر / شیخینؒ کا تعلیمی سفر...70
مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

Elopements and Our Legal Framework...79
Abu Ammar Zahid-ur-Rashdi

(جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ پارلیمنٹ میں دستورِ پاکستان کی ۲۶ویں ترمیم منظور ہوئی ہے، اس پر ملک بھر میں ہر سطح پر بحث جاری ہے۔ چونکہ اس میں بعض باتیں شریعت اور نفاذِ اسلام سے متعلق ہیں اس لیے دینی حلقے بھی اس پر مسلسل مکالمہ و مباحثہ کر رہے ہیں۔ یہ ترامیم جیسے بھی ہوئی ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے، میں اس بحث میں نہیں پڑتا، لیکن ان کے ذریعے دینی ماحول میں کیا فرق پڑا ہے اور اب آئندہ دینی جدوجہد کرنے والوں نے کیا کرنا ہے؟ یہ دو باتیں مختصراً عرض کروں گا۔ ان ترامیم کے ذریعے دینی جدوجہد کے تین چار اہم تقاضے اصولاً پورے ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ موجودہ دستور ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا تھا تو اس میں یہ طے پایا تھا کہ حکومتِ پاکستان جلد از جلد سودی نظام کو ختم کر کے ملک کو سود کی نحوست سے پاک کرے گی۔ تب سے عدالتی، سیاسی اور تحریکی جدوجہد جاری ہے جبکہ ہمارا ایک بڑا مطالبہ چلا آرہا ہے کہ اس ''جلد از جلد'' کی کوئی تاریخ طے کی جائے۔ اس ترمیم کے ذریعے یہ تاریخ طے ہو گئی ہے جو کہ ۳۱ دسمبر ۲۰۲۷ء ہے۔ ترمیم میں یہ لکھا ہے کہ حکومت پاکستان دستوری طور پر پابند ہے کہ یکم جنوری ۲۰۲۸ء سے پہلے ملک کو سودی نظام سے پاک کرے اور سودی قوانین اور سودی نظام ختم کرے۔ اس سے ہم پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ مطالبہ کر سکیں گے کہ دو سال رہ گئے ہیں، ڈیڑھ سال رہ گیا ہے۔ جیسے قرضے کی ادائیگی کی تاریخ طے ہو جائے تو قرضہ مانگنا ذرا آسان ہو جاتا ہے، جبکہ اگر مبہم ہو کہ قرضہ جلد از جلد دے گا، تو وہ جلد از جلد کبھی آتا ہی نہیں ہے۔ جو کہ اس معاملے میں پچاس سال سے نہیں آرہا تھا، اب تاریخ طے ہو گئی ہے اور ہمارا ایک مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہوئی ہے کہ ملک کے قوانین کا جائزہ لینے کے لیے وفاقی شرعی عدالت ایک مستقل عدالت ہے، جس کا کام یہ ہے کہ ملک میں نافذ قوانین کا جائزہ لے کر ان کے متعلق فیصلہ کرے کہ فلاں قانون شریعت کے مطابق ہے

اور فلاں شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ فلاں قانون میں یہ تبدیلی ضروری ہے، فلاں میں یہ تبدیلی ضروری ہے۔ وفاقی شرعی عدالت میں علماء بھی ہیں اور دوسرے جج صاحبان بھی ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت نے بڑے بڑے اچھے فیصلے کر رکھے ہیں جو کہ ریکارڈ میں موجود ہیں۔

کسی عدالت کے فیصلہ کے خلاف بالائی عدالت میں اپیل کرنا ایک قانونی حق ہے۔ عام عدالتی طریقہ کار یہ ہے کہ کسی کیس پر کوئی فریق جب بالائی عدالت میں اپیل کرتا ہے، جیسا کہ سیشن کورٹ کے فیصلے پر ہائی کورٹ میں، یا ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیلیں ہوتی ہیں، اگر وہ فریق فیصلہ کے خلاف حکمِ امتناعی یعنی سٹے بھی لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے الگ درخواست دینا پڑتی ہے، اس میں جج صاحبان چیک کرتے ہیں کہ سٹے بنتا ہے یا نہیں بنتا۔

جبکہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کا طریقہ کار یہ ہے کہ اپیل دائر کرنے کے ساتھ ہی خودبخود سٹے ہو جاتا ہے، اس کے لیے الگ سے درخواست نہیں دینا پڑتی۔ کوئی بحث نہیں کرنا پڑتی، دلیل نہیں دینا پڑتی اور عدالت کو مطمئن نہیں کرنا پڑتا۔ جس سے ہمارے بہت سے مسائل اس سٹے پر اٹکے پڑے ہیں، اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر ہوتے ہی خودبخود سٹے نہ ہو جائے بلکہ الگ درخواست دیں اور عدالت کو دلائل دے کر مطمئن کریں کہ سٹے ضروری ہے۔

حالیہ ترمیم میں یہ بات مان لی گئی ہے بلکہ اس میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہے کہ اگر سٹے کے بعد سپریم کورٹ یا بالائی عدالت ایک سال کے اندر اندر فیصلہ نہیں کرتی تو شرعی عدالت کا فیصلہ خودبخود نافذ ہو جائے گا، ورنہ کئی کیس بیس بیس سال سے لٹکے ہوئے ہیں اور فریزر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا یہ بڑا مطالبہ تھا جو الحمد للہ پورا ہو گیا ہے۔ اس ترمیم سے ہمیں دوسرا بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے اسلامی نظریاتی کونسل جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت بنی تھی اور ہر دور میں کام کرتی رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کو گورنمنٹ یا کوئی پارٹی درخواست دے کہ فلاں قانون شریعت کے مطابق نہیں ہے، تو اس میں علماء، وکلاء اور جج صاحبان بیٹھ کر غور کرتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں تو یہ قانون شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ہے، اور اس کو شریعت کے مطابق بنانے کے لیے کیا کرنا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کسی قانون کے بارے میں از خود بھی سفارش کر سکتی ہے اور کسی درخواست پر بھی سفارش کر سکتی ہے۔ کسی قانون کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل رائے دے گی کہ یہ شریعت کے خلاف ہے یا اس کی فلاں شق شریعت کے خلاف ہے، اور متبادل یہ ہونا چاہیے، تو وہ جس اسمبلی سے متعلق ہے، قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی، وہ سفارش اس اسمبلی میں پیش ہو گی جو اس کے مطابق قانون سازی کرے گی۔

البتہ یہ بات کہ کونسل کی سفارش اسمبلی میں کب پیش ہو گی اور کون پیش کرے گا، یہ معاملہ ابہام میں تھا۔ سینکڑوں سفارشات وزارت قانون میں سالہا سال سے پڑی ہوئی ہیں، ان کی مرضی ہے کہ پیش کریں یا نہ کریں۔ اس پر ہمارا مطالبہ

یہ تھا کہ اس کی کوئی مدت طے کی جائے، تو حالیہ ترامیم کے ذریعے وہ مدت طے ہو گئی ہے کہ وہ سفارشات جس اسمبلی سے متعلق ہیں، متعلقہ محکمہ ان سفارشات کو ایک سال کے اندر اسمبلی میں پیش کر کے اس کے مطابق نئی قانون سازی کا پابند ہو گا۔ اس کے لیے بھی ایک سال کی مدت طے ہو گئی ہے کہ جب اسلامی نظریاتی کونسل کسی قانون کے بارے سفارش کرے تو وزارت قانون اور متعلقہ محکمہ متعلقہ اسمبلی میں ایک سال کے اندر پیش کرنے کا اور اس پر بحث کر کے قانون سازی کا پابند ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ ملک کا عام طریق کار جو رجسٹریشن کا ہے اکثر و بیشتر مدارس اس کے مطابق رجسٹرڈ ہیں۔ جس طرح دوسرے اداروں کے اکاؤنٹس ہیں، مدارس کے بھی اکاؤنٹس ہیں۔ لیکن دینی مدارس کے بارے میں اب تک عالمی سطح پر اور ملکی سطح پر جو فضا بنائی گئی، اس کے پیش نظر دہشت گردی کے ٹائٹل کے ساتھ دینی مدارس کے لیے الگ ضوابط بنائے گئے تھے، جس کے تحت بہت سے دینی مدارس کی رجسٹریشن کافی عرصے سے رکی ہوئی ہے، متعلقہ محکمہ کی مرضی ہے کہ رجسٹریشن کرے یا نہ کرے، اور بہت سے مدارس اکاؤنٹس بھی اس طریقہ سے منجمد ہیں، بعض کے نہیں بن رہے۔

اس پر ہمارا موقف یہ ہے کہ جو ملک کا عام قانون ہے رجسٹریشن کا اور اکاؤنٹس کا، وہ جیسے دوسرے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے لیے ہے، مدارس کے لیے بھی وہی قانون ہونا چاہیے۔ مدارس کے لیے رجسٹریشن اور اکاؤنٹ کا امتیازی قانون دینی مدارس سے زیادتی ہے۔ یہ مطالبہ وہ بھی پورا ہو گیا ہے کہ اب مدارس کے لیے الگ پراسس نہیں ہو گا بلکہ جیسے باقی اداروں کی نارمل رجسٹریشن ہوتی ہے دینی مدارس کی بھی ہو گی، اور جیسے باقی اداروں کا اکاؤنٹ سسٹم ہوتا ہے وہی دینی مدارس کا بھی ہو گا۔

یہ چار بڑی پیشرفت ہوئی ہیں الحمد للہ۔ جو بھی معاملات کو سمجھتا ہے وہ اس پر خوشی کا اظہار کرے گا اور ہم نے بھی اظہارِ مسرت کیا ہے، ہم ضدی لوگ نہیں ہیں کہ صحیح بات کو بھی غلط کہیں۔ یہ ہمارے مطالبات تھے، تقاضے تھے اور دینی جدوجہد کی گزارشات تھیں۔

یہ تو ہو گیا ہے، اب اگلی بات کہ ہم نے کیا کرنا ہے؟ اس حوالے سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں معمول یہ ہے کہ ہم متحرک اور منظم ہو کر کوئی بات کہتے ہیں تو اس پر عمل ہو جاتا ہے، جس معاملے میں خاموش رہتے ہیں تو وہ معاملہ لٹکا رہتا ہے۔ ایک عام سا محاورہ ہے کہ بچہ جب تک نہ روئے اسے ماں بھی دودھ نہیں پلاتی۔ ہمارا قومی مزاج بھی یہ ہے۔ اس کے لیے ہماری دو قوتیں ہیں جن کے ذریعے ہم باتیں منوایا کرتے ہیں۔ ایک قوت ہماری وحدت ہے۔ تقریباً ساٹھ سال مجھے بھی اس جدوجہد میں ہو گئے ہیں، میرا تجربہ ہے کہ جو بات ہم تمام مکاتب فکر نے مل کر کی ہے، ان میں سے اکثر ہماری بات مانی گئی ہے۔ اور ہماری دوسری قوت اسٹریٹ پاور ہے یعنی پبلک کا بیدار ہونا اور عوامی احتجاج۔ ہمارے ہاں یہ دو ہی ہتھیار ہیں۔ سیاسی طور پر بھی یہی دو ہتھیار ہیں کہ جس بات کے پیچھے پبلک ہو اور جس بات کے پیچھے وحدت ہو وہ

پوری ہو جاتی ہے، اور جس کے پیچھے وحدت اور پبلک نہ ہو وہ پوری نہیں ہوتی۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ چار باتیں فیصلے نہیں ہیں بلکہ وعدے ہیں، ہم مغالطے میں نہ رہیں، پہلے زبانی وعدے تھے اور اب دستوری وعدے ہیں۔ اس کو یوں سمجھیے کہ جو معاملات چل رہے تھے، دستور میں آنے سے متعلقہ ادارے پابند ہو گئے ہیں۔ مگر ان وعدوں پر عملدرآمد کے لیے ہمیں پہلے سے زیادہ کام کرنا ہوگا۔ ہم منظم رہیں گے، متحد رہیں گے، متحرک رہیں گے تو عمل ہوگا ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ الحمد للہ ہمارے ہاں یہ ماحول ہے کہ جب ہم کسی دینی وملی مقصد کے لیے میدان میں آتے ہیں، دینی جماعتیں اکٹھی ہوتی ہیں تو تاجر برادری بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے، چیمبر اور وکلاء بھی ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ ختم نبوت کے مسئلے پر اور دیگر مسائل پر بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ محاذ ہمیں متحرک رکھنا پڑے گا اور وحدت قائم رکھنا پڑے گی۔

سود کا مسئلہ بالخصوص کہ اس کے لیے تین سال کا وقت طے ہوا ہے۔ اگر ہم تین سال متحرک رہیں گے تو پیشرفت ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔ اس پر ہم گوجرانوالہ میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی مشترکہ میٹنگ کر چکے ہیں۔ تحریک انسدادِ سود پاکستان ایک مشترکہ فورم پہلے سے چلا آرہا ہے جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ سب شامل ہیں۔ اس کا ایجنڈا سودی نظام کے خاتمے کے لیے جدوجہد ہے۔ ہم دس بارہ سال سے کام کر رہے ہیں۔ تحریک انسدادِ سود پاکستان کی ذمہ داریاں اس وقت مجھ پر ہیں، اس کی رابطہ کمیٹی کا کنوینر ہوں۔ اس لیے ہم نے فیصلہ آتے ہی محسوس کیا کہ ہمارا کام ہو نہیں گیا بلکہ اب ہمیں کام کرنا ہے۔ الحمد للہ ہم نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کی گوجرانوالہ میں میٹنگ کی ہے اور یہ طے کیا ہے کہ تحریک انسدادِ سود پاکستان کو از سر نو ہر سطح پر منظم کیا جائے گا۔ اس میں وکلاء بھی ہوں گے، تاجر برادری بھی ہوگی اور علماء بھی ہوں گے۔ اس کے لیے کام کے آغاز کے لیے ہم نے ۳۱ اکتوبر ۲۰۲۴ء کو گوجرانوالہ میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا، وکلاء کا اور تاجر برادری کا مشترکہ کنونشن طلب کر لیا ہے کہ ہم نے اس معاملے کو سنبھالنا ہے۔ اس کنونشن میں ہم یہ طے کریں گے کہ ہمارے پاس جو تین سال کا وقت ہے اس میں ہمیں فارغ نہیں بیٹھنا بلکہ ہم ہر حوالے سے اپنی جدوجہد، مطالبہ اور دباؤ قائم رکھیں گے، ان شاء اللہ العزیز، تاکہ جنہوں نے وعدہ کیا ہے اور جن کے ذمے بات لگی ہے، وہ وقت کے اندر اندر اپنا کام پورا کریں۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ دعا بھی فرمائیں، تعاون بھی فرمائیں اور جہاں جہاں آپ کے بس میں ہو آواز بھی اٹھائیں، تاکہ مقررہ وقت کے اندر اندر یہ ہماری دینی وملی ضروریات پوری ہو سکیں کہ سود کا خاتمہ ہماری قومی ضرورت ہے، دینی ضرورت ہے اور شرعی تقاضا ہے، اور ہم مل جل کر ان فیصلوں پر عملدرآمد کرانے میں کامیاب ہو جائیں، آمین یا رب العالمین۔

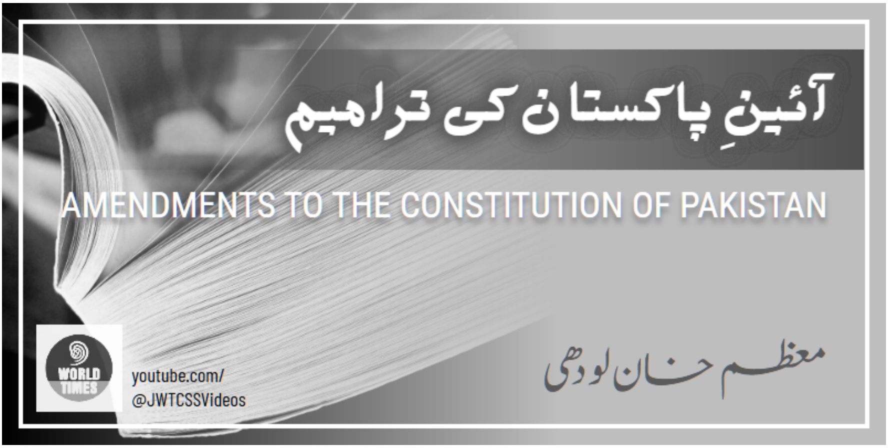

(دستورِ پاکستان کی اب تک کی ترامیم کے حوالے سے یوٹیوب چینل "ورلڈ ٹائمز" کی ایک ویڈیو کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

السلام علیکم۔ میرا نام معظم خان لودھی ہے۔ ناظرین آئین کسی بھی ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور آئین کو ہم ''سپریم لاء آف دی لینڈ'' بھی کہتے ہیں، اور اس کے علاوہ موجود جتنے بھی قوانین ہوتے ہیں انہیں ''سب آرڈینیٹ لاز'' (ماتحت قوانین) کہا جاتا ہے۔ آئین کیا ہوتا ہے؟ مختصر طور پر

Constitution are those basic principles that guide a state and its different organs how they should work.

''آئین وہ بنیادی اصول ہیں جو ریاست اور اس کے مختلف اداروں کی رہنمائی کرتے ہیں کہ انہیں کیسے کام کرنا چاہیے۔''

جو آئین تحریر شدہ ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ سے منظور شدہ ہوتے ہیں انہیں Rigid کہا جاتا ہے۔ اور جو آئین باضابطہ طور پر تحریر شدہ نہیں ہوتے اور پارلیمنٹ سے منظور شدہ نہیں ہوتے انہیں Flexible کہا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ سے منظور شدہ آئین کی ترمیم کا طریقہ کار مشکل اور لمبا ہوتا ہے۔ پاکستان کا آئین تحریر شدہ ہے جس کے اندر اب تک چھبیس ترامیم ہو چکی ہیں۔ امریکہ کا دستور، جس کو The Most Rigid Constitution کہا جاتا ہے، اس میں دو ڈھائی سو سال کے بعد بھی صرف ستائیس ترامیم ہوئی ہیں۔

آئین میں ترمیم کیسے ہوتی ہے؟ ذرا اس کو دیکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر تحریر شدہ آئین میں اس کی ترمیم کا مکمل طریق کار لکھا جاتا ہے۔ پاکستان کے آئین کی دفعہ ۲۳۸ میں لکھا گیا ہے کہ پاکستان کے آئین میں مجلس شوریٰ یعنی پارلیمنٹ ترمیم کر سکتی ہے۔ اور اس کا طریق کار دفعہ ۲۳۹ میں لکھا گیا ہے کہ پاکستان کے اندر آئینی ترمیم کا بل کسی بھی ایوان سے منظور ہو سکتا

ہے: سینٹ یعنی ایوانِ بالا سے بھی، اور قومی اسمبلی یعنی ایوانِ زیریں سے بھی۔ کسی بل کو منظوری کے لیے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بل منظور ہونے کے بعد دوسرے ایوان میں بھیجا جائے گا۔ اگر دوسرے ایوان میں اسے دو تہائی اکثریت مل جاتی ہے تو وہ دستخط کے لیے صدر پاکستان کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ اگر صدر پاکستان اس پر دستخط کر دیتے ہیں تو یہ آئینی ترمیم پوری ہو جائے گی۔

البتہ مسئلہ یہاں پر آتا ہے کہ جب پہلے ایوان سے بل منظوری کے بعد دوسرے ایوان میں بھیجا جائے، اور دوسرے ایوان سے وہ کسی ترمیم کے ساتھ منظور کیا جائے، تو پھر وہ صدر پاکستان کے پاس نہیں بھیجا جائے گا، بلکہ پہلے ایوان کے پاس واپس بھیجا جائے گا جو اسے دوبارہ دو تہائی اکثریت کے ساتھ منظور کرے گی۔ اگر پہلے ایوان نے بغیر کسی ترمیم کے اسے منظور کر لیا تو پھر وہ دستخط کے لیے صدر پاکستان کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

اگر آئین کے اندر کوئی ایسی ترمیم کی جا رہی ہے کہ جس کے ذریعے کسی صوبے کی سرحدات کو تبدیل کیا جا رہا ہے، تو وہ بل تب تک صدر کے پاس نہیں بھیجا جاتا جب تک وہ بل اس صوبائی اسمبلی سے دو تہائی اکثریت سے منظور نہیں ہو جاتا۔ جس کی مثال خیبر پختونخوا اور فاٹا کے ادغام کی ہے۔ اس سلسلہ میں پچیسویں آئینی ترمیم کا بل تب تک صدر پاکستان کے پاس نہیں گیا جب تک خیبر پختونخوا اسمبلی نے اسے دو تہائی اکثریت سے منظور نہیں کیا۔

پاکستان کے اندر پارلیمانی نظام کی بالادستی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ پاکستان کے آئین کے اندر کسی بھی قسم کی ترمیم کر سکتی ہے، اور یہ ترمیم پاکستان کی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں ہو سکتی۔

اب ہم چلتے ہیں پاکستان کی آئینی ترامیم کی طرف۔ پاکستان میں اب تک کل چھبیس آئینی ترامیم ہو چکی ہیں۔ ان میں سے پہلی سات ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے دور میں ہوئی تھیں۔

آئینی ترامیم

پہلی آئینی ترمیم مئی ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی، اور آئین کے اندر جہاں جہاں مشرقی پاکستان کا حوالہ موجود تھا اسے ختم کیا گیا۔ آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگلہ دیش جو پہلے مشرقی پاکستان تھا، وہ تو ۱۹۷۱ء میں ہی آزاد ہو گیا تھا، تو اس کا حوالہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو بنگلہ دیش کو بطور آزاد ریاست کے تسلیم کیا تھا۔ یعنی اس سے پہلے پاکستان بنگلہ دیش کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم ہی نہیں کرتا تھا، اس لیے مشرقی پاکستان کا حوالہ آئین کے اندر موجود تھا۔ پھر بھٹو صاحب نے پہلا جو دورہ کیا تھا بنگلہ دیش کا، اس کے بعد پاکستان کے آئین میں مئی ۱۹۷۴ء کے دوران ترمیم ہوئی۔

دوسری آئینی ترمیم میں مسلمان کی تشریح کا اضافہ کیا گیا۔ یہ ترمیم ستمبر ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی جس کے ذریعے قادیانیوں اور احمدیوں کو پاکستان نے غیر مسلم قرار دے دیا تھا۔

تیسری آئینی ترمیم پریوینٹوڈ ٹنشن (احتیاطی حراست) کے متعلق ہے۔ یہ فروری ۱۹۷۵ء میں آئی تھی۔ ایک ہوتا ہے Imprisonment (قید) اور دوسرا ہوتا ہے Detention (حراست)۔ قید اس شخص کو دی جاتی ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو، اور وہ جیل چلا جاتا ہے۔ لیکن حراست اس شخص کی ہوتی ہے جس نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہوتا لیکن ایسا شک ہوتا ہے کہ وہ کہیں مستقبل قریب میں کوئی جرم کر سکتا ہے تو اس سے روکنے کے لیے اس کو حراست میں لے لیا جاتا ہے۔ تو پہلے یہ حراست ایک مہینے کے لیے ہوا کرتی تھی، تیسری آئینی ترمیم میں اس کی مدت بڑھا کر تین ماہ کر دی گئی تھی۔

چوتھی آئینی ترمیم (نومبر ۱۹۷۵ء) تیسری ترمیم کے ساتھ منسلک ہے۔ چوتھی آئینی ترمیم میں ہائی کورٹس اور دیگر کورٹس کا یہ اختیار واپس لے لیا گیا کہ وہ زیر حراست شخص کی ضمانت لے سکتے ہیں۔

پانچویں آئینی ترمیم (ستمبر ۱۹۷۶ء) چوتھی ترمیم کے ساتھ منسلک ہے۔ پانچویں ترمیم کے ذریعے ہائی کورٹ کے کچھ مزید اختیارات کو کم کیا گیا۔ مثلاً، ہائی کورٹ کو منع کر دیا گیا کہ وہ کوئی ایسا آرڈر جاری نہیں کر سکتی جس کی رو سے پولیس اسٹیشن کے اندر کوئی رپورٹ اگر درج ہو رہی ہے تو اس کو روکا جا سکے۔ اس کے علاوہ یکم جولائی ۱۹۷۰ء کے بعد سے سندھ اور بلوچستان ہائی کورٹس ختم ہو گئی تھیں اور ان کی ایک مشترکہ ہائی کورٹ کام کر رہی تھی۔ پانچویں آئینی ترمیم کے ذریعے ان کو علیحدہ کر دیا گیا، یعنی اب سندھ کی ہائی کورٹ علیحدہ ہو گئی اور بلوچستان کی ہائی کورٹ علیحدہ ہو گئی۔

چھٹی آئینی ترمیم (دسمبر ۱۹۷۶ء) بہت سادی سی تھی کہ سپریم کورٹ کے ججز کی ریٹائرمنٹ کی عمر کو ۶۵ سال کر دیا گیا، اور ہائی کورٹ کے ججز کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۲ سال کر دی گئی۔

ساتویں آئینی ترمیم (مئی ۱۹۷۷ء) ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے دورِ حکومت کی آخری ترمیم تھی جس کے ذریعے وزیر اعظم پاکستان کو اختیار مل گیا تھا کہ وہ اعتماد کا ووٹ لے سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ ایڈوائس کریں گے صدر پاکستان کو۔ وہ ایک ریفرنڈم کمیشن بنائے گا جس کے ذریعے وزیراعظم اعتماد کا ووٹ لے گا۔

آٹھویں آئینی ترمیم (نومبر ۱۹۸۵ء) بہت اہمیت کی حامل ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ پاکستان میں پارلیمانی نظام کی بالادستی ہے جس کے مطابق وزیراعظم کے پاس سب سے زیادہ اختیار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے لحاظ سے حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوتا ہے۔ لیکن ۱۹۸۵ء میں کیونکہ پاکستان کے اندر مارشل لاء موجود تھا، تو جنرل ضیاء الحق نے آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعے پاکستان کے پارلیمانی نظام کو نیم صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ اس کی مثال ہے آرٹیکل ۵۸ (۲ بی)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب صدر پاکستان کے پاس یہ اختیار آ گیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت نیشنل اسمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعے محمد خان جونیجو کی گورنمنٹ، بے نظیر بھٹو صاحبہ کی گورنمنٹ، میاں محمد نواز شریف صاحب کی گورنمنٹ، اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کی دوسری گورنمنٹ کو تحلیل کیا گیا تھا۔

نویں آئینی ترمیم (اگست ۱۹۸۶ء) پاکستان میں نفاذِ شریعت سے متعلق ہے۔ لیکن یہ آئینی ترمیم دونوں ایوانوں سے پاس نہیں ہو سکی تھی، صرف سینٹ سے منظور ہوئی اور نیشنل اسمبلی سے منظور نہیں ہوئی۔ آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر یہ ترمیم منظور نہیں ہوئی تو اس کو پھر بھی آئینی ترمیم کیوں کہا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اگر کوئی ترمیم کسی ایک ایوان سے

منظور ہو جائے تو اس کے ساتھ ایک نمبر منسلک کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ترمیم سینٹ سے منظور ہو گئی تھی اس لیے اس کو نویں ترمیم کا نمبر دے دیا گیا تھا۔ لیکن کیونکہ یہ ترمیم نیشنل اسمبلی سے منظور نہیں ہوئی اس لیے اس کا ملک میں نفاذ نہیں ہو سکا۔

دسویں آئینی ترمیم (مارچ ۱۹۸۷ء) سینٹ اور نیشنل اسمبلی کے اجلاسوں کے درمیان وقفہ سے متعلق ہے۔ اس سے پہلے آئینی طور پر ان کے اجلاسوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ وقفہ ۱۶۰ دن کا ہو سکتا تھا، لیکن اب اس وقفہ کو کم کر کے ۱۳۰ دن کر دیا گیا۔

گیارہویں آئینی ترمیم (دسمبر ۱۹۸۹ء) بھی نویں ترمیم کی طرح دونوں ایوانوں سے منظور نہیں ہو سکی۔ اس میں خواتین کے لیے نشستوں کے کوٹہ کی نظر ثانی کی بات کی گئی۔ چونکہ یہ ایک ایوان سے منظور ہو گئی تھی اس لیے اس کے ساتھ ایک نمبر منسلک کر دیا گیا جو کہ گیارہویں ترمیم بنتی ہے۔

بارہویں ترمیم (جولائی ۱۹۹۱ء) سپیڈی ٹرائل کورٹس (مقدمات کی فوری سماعت کی عدالتوں) کے بارے میں ہے۔ اس میں وفاقی حکومت کے پاس یہ اختیار آ گیا کہ وہ ہینئس کرائمز (گھناؤنے جرائم) کے لیے تین سالہ سپیڈی ٹرائل کورٹس بنا سکتی ہے۔

تیرہویں آئینی ترمیم (اپریل ۱۹۹۷ء) پارلیمانی نظام کی بحالی سے متعلق ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ابھی ہم نے تھوڑی دیر پہلے بات کی کہ آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعے جنرل ضیاء الحق صاحب نے پاکستان کے پارلیمانی نظام کو نیم صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا تھا، جس سے صدر پاکستان کے پاس نیشنل اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار آ گیا تھا۔ چنانچہ اس تیرہویں آئینی ترمیم کے ذریعے اس صدارتی اختیار کو ختم کر کے پاکستان کے لیے پارلیمانی نظام بحال کر دیا گیا۔

چودھویں آئینی ترمیم (جولائی ۱۹۹۷ء) ہارس ٹریڈنگ سے متعلق ہے۔ ۱۹۹۷ء میں میاں محمد نواز شریف صاحب کی وہ واحد حکومت تھی کہ جس میں وزیر اعظم کے پاس ایوان میں تقریباً دو تہائی اکثریت موجود تھی اور وہ سنگل ہینڈڈلی (بغیر کسی سیاسی اتحاد کے) حکومت کر رہے تھے۔ ہارس ٹریڈنگ یعنی یہ جو ممبران صوبائی اسمبلی اور قومی اسمبلی ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری پارٹی میں چلے جاتے ہیں، یا فارورڈ بلاک بنا لیتے ہیں، اس کو روکنے کے لیے ایک چودھویں آئینی ترمیم لائی گئی۔ اس کے ذریعے پارٹی کے سربراہ کو یہ اختیار مل گیا کہ اگر کوئی بھی ممبر پارلیمنٹ، یا ممبر صوبائی اسمبلی اس کام میں ملوث ہے تو وہ اس کو پارٹی سے نکال بھی سکتا ہے۔ چودھویں آئینی ترمیم کے بعد وزیر اعظم کے پاس بہت زیادہ اختیارات آ گئے تھے، کیونکہ اس سے پہلے وہ صدر کا اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار بھی ختم کر چکے تھے۔

پندرہویں آئینی ترمیم (اگست ۱۹۹۸ء) بھی آٹھویں ترمیم کی طرح نفاذِ شریعت کے متعلق تھی۔ یہ ترمیم نیشنل اسمبلی سے تو پاس ہو گئی لیکن سینٹ نے اس کو پاس نہیں کیا۔ آئینِ پاکستان کی نویں، گیارہویں اور پندرہویں ترامیم ایسی ہیں کہ جو ایک ایوان سے منظور ہوئیں لیکن دوسرے ایوان سے منظور نہیں ہو سکی تھیں اس لیے ان کا نفاذ نہیں ہو سکا۔

سولہویں آئینی ترمیم (اگست ۱۹۹۹ء) کوٹہ سسٹم سے متعلق ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ ۲۷ میں اقلیتوں اور پسماندہ

علاقوں سے تعلق رکھنے والوں کو نمائندگی دینے کے لیے دس سال کا کوٹہ سسٹم متعارف کرایا گیا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں اس کوٹہ کو بڑھا کر بیس سال کر دیا گیا۔ اور ۱۹۹۹ء میں یہ کوٹہ مزید بڑھا کر چالیس سال کر دیا گیا۔

سترہویں آئینی ترمیم (دسمبر ۲۰۰۳ء) جنرل پرویز مشرف کے مارشل لاء دور میں ہوئی۔ اس کے ذریعے جنرل ضیاء الحق کی آٹھویں ترمیم کے اس نیم صدارتی نظام کو بحال کر دیا گیا جسے میاں محمد نواز شریف کی حکومت نے تیرہویں آئینی ترمیم کے ذریعے ختم کیا تھا۔ یعنی اب صدر پاکستان کے پاس ایک بار پھر نیشنل اسمبلی کو ختم کرنے کا اختیار آ گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صرف نیشنل اسمبلی کو تحلیل کیا جا سکتا ہے، سینٹ کو تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔

اٹھارہویں آئینی ترمیم (اپریل ۲۰۱۰ء) پاکستان کی آئین کی سب سے بڑی ترمیم ہے، اتنی بڑی کہ اسے چھوٹا آئین بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ۱۰۳ دفعات میں ترامیم کی گئیں۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ سب سے پہلے سترہویں آئینی ترمیم کے نیم صدارتی نظام کو ختم کر کے پارلیمانی نظام بحال کیا گیا۔ پاکستان میں صوبائی خود مختاری متعارف کرائی گئی۔ نارتھ ویسٹ فرنٹیر پروونس (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کا نام تبدیل کر کے خیبر پختونخوا کر دیا گیا۔ خیبر پختونخوا والوں کا یہ مطالبہ کافی عرصہ سے چل رہا تھا، کیونکہ پنجابیوں کا صوبہ پنجاب تھا، سندھیوں کا صوبہ سندھ تھا، لیکن ہمارے پختون بھائیوں کا صوبہ این ڈبلیو ایف پی تھا، چنانچہ اس ترمیم کے ذریعے ان کا یہ مطالبہ پورا ہوا۔ اس کے علاوہ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے ایک کام یہ ہوا کہ جوڈیشل کمیشن آف پاکستان (JCP) متعارف کرایا گیا، جس کے ذریعے اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کی تقرری کی جائے گی۔

انیسویں آئینی ترمیم (دسمبر ۲۰۱۰ء) جوڈیشل کمیشن آف پاکستان کے متعلق ہے۔ اس کے ذریعے آئین کی دفعہ ۱۷۵ اے میں ترمیم ہوئی جس میں وزیر اعظم کو ججوں کی تقرری کے عمل میں شامل کیا گیا۔ اب طریقہ کار یہ ہو گیا کہ جوڈیشل کمیشن ججوں کی نامزدگیاں پارلیمانی کمیٹی کے پاس بھیجے گا، پارلیمانی کمیٹی انہیں وزیر اعظم کے پاس بھیجے گی، وزیر اعظم انہیں منظور کر کے صدر کے پاس بھیجے گا، صدر اس پر دستخط کر کے ججوں کی تقرری کی حتمی منظوری دے گا۔ اسی طرح جوڈیشل کمیشن میں پہلے دو سینئر ججوں کی شمولیت تھی، اس آئینی ترمیم کے ذریعے ان کی تعداد چار کر دی گئی۔ اس کے علاوہ لکی مروت اور ٹانک کے جو ملحقہ قبائلی علاقے تھے انہیں فاٹا کے اندر ضم کر دیا گیا۔

بیسویں آئینی ترمیم (فروری ۲۰۱۲ء) نگران حکومت کے قیام سے متعلق ہے۔ پاکستان میں جب نیشنل اسمبلی اپنے پانچ سال پورے کر لے گی اور نئے الیکشن ہونے والے ہوں گے تو اس سے پہلے نگران حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس کے مطابق ایک پارلیمانی کمیٹی بنائی جائے گی جس میں چار ممبران گورنمنٹ سے اور چار اپوزیشن سے ہوں گے۔ ان آٹھ ممبران کے پاس تین دن کا وقت ہو گا جس میں یہ مرکز کے اندر نگران وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کی تقرری کریں گے۔ اسی طرح ہر صوبہ میں آٹھ ممبران کی کمیٹی بنائی جائے گی جس میں چار گورنمنٹ سے اور چار اپوزیشن سے ہوں گے، اور وہ اپنے صوبے میں نگران وزیر اعلیٰ کی تقرری کریں گے۔ یہ پارلیمانی کمیٹی اگر تین دن کے اندر یہ معاملہ سرانجام نہیں دے گی تو پھر یہ معاملہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کو منتقل ہو جائے گا جو نگران حکومت کی تقرری کرے گا۔

اکیسویں آئینی ترمیم (جنوری ۲۰۱۵ء) فوجی عدالتوں کے قیام سے متعلق ہے۔ پاکستان کی تاریخ کا ایک بڑا سانحہ پیش آیا

تھا جسے ہم ”سانحہ پشاور“ کہتے ہیں جس میں آرمی پبلک اسکول کے بچے شہید کر دیے گئے تھے۔ اس کے لیے ضرورت پڑی کہ پاکستان کے اندر ایک ایسا عدالتی نظام بھی موجود ہو جو تیز رفتاری سے دہشت گردوں کے مقدمات کے فیصلے کر کے انہیں ان کے انجام تک پہنچائے۔ اس آئینی ترمیم کے ذریعے دو سال کے عرصہ کے لیے فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ اس کے اندر ایک ”سن سیٹ کلاز“ موجود تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عدالتیں اپنی دو سالہ مدت پوری کر کے خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

بائیسویں آئینی ترمیم (جون ۲۰۱۶ء) الیکشن کمیشن کے طریق کار کے متعلق ہے کہ چیف الیکشن کمشنر آف پاکستان کو اپوزیشن اور گورنمنٹ مل کر مقرر کرے گی۔ چیف الیکشن کمشنر کی ریٹائرمنٹ کی عمر کو ۶۵ سے بڑھا کر ۶۸ سال کر دیا گیا۔ جبکہ الیکشن کمیشن کے ممبران کی ریٹائرمنٹ عمر کو ۶۲ سے بڑھا کر ۶۵ سال کر دیا گیا۔ ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ اس سے پہلے صرف ریٹائرڈ ججوں کو الیکشن کمیشن کا ممبر بنایا جاتا تھا، لیکن اس آئینی ترمیم کے بعد الیکشن کمیشن کا ممبر کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ الیکشن کمیشن کے پانچ ممبران میں سے ایک چیف الیکشن کمشنر ہوتا ہے، باقی چار ممبران چاروں صوبوں سے آتے ہیں۔

تئیسویں آئینی ترمیم (جنوری ۲۰۱۷ء) فوجی عدالتوں کے متعلق ہے کہ اکیسویں آئینی ترمیم کے ذریعے بننے والی ان عدالتوں کی مدتِ قیام مزید دو سال بڑھا دی گئی اور انہیں جنوری ۲۰۱۹ء تک ایکسٹنشن مل گئی۔

چوبیسویں آئینی ترمیم (دسمبر ۲۰۱۷ء) میں مردم شماری کے بعد پاکستان کی کل آبادی اور صوبوں کی آبادی کا تخمینہ لگایا گیا، جس کے اعتبار سے نیشنل اسمبلی کی نشستوں میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ وہ اس طرح کہ نیشنل اسمبلی کے لیے پنجاب کی آٹھ سیٹیں کم کر کے اس میں سے چار خیبر پختونخوا کو اور چار بلوچستان کو دے دی گئیں۔ یعنی نیشنل اسمبلی کی سیٹوں کی کل تعداد تو وہی ۳۴۲ رہی لیکن صوبوں کے حوالے سے یہ ردوبدل ہوئی۔

پچیسویں آئینی ترمیم (مئی ۲۰۱۸ء) کے ذریعے فاٹا کا علاقہ خیبر پختونخوا میں ضم کر دیا گیا، اور فاٹا کی نیشنل اسمبلی کے لیے کل نششتوں کی تعداد جو اس سے پہلے ۱۲ تھی، انہیں کم کر کے ۶ کر دیا گیا۔ البتہ مئی ۲۰۱۹ء میں فاٹا کو یہ تعداد واپس مل کر پھر ۱۲ ہو گئی۔ اسی طرح خیبر پختونخوا اسمبلی کے اندر جو فاٹا کے ایریاز کی کل نشستیں ۱۶ ہوا کرتی تھیں، ادغام کے بعد اس تعداد کو بڑھا کر ۲۴ کر دیا گیا۔

امید ہے کہ پاکستان کے آئین کی اب تک کی یہ ترامیم آپ کو سمجھ آ گئی ہوں گی۔ آئینِ پاکستان میں ترمیم کے متعلق دفعہ ۲۳۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کام پارلیمنٹ کر سکتی ہے، اور اس کا طریق کار دفعہ ۲۳۹ میں لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ویڈیو آپ کے لیے معلوماتی ثابت ہوئی ہوگی۔ بہت شکریہ۔

https://youtu.be/HQ2mOZ_CnYo

(539) وأحضرت الأنفس الشح

درج ذیل آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے بعض مترجمین نے نفس کا مائل ہونا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ لفظ 'أُحْضِرَتْ' سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ نفس میں شامل ہوجانا اور رچ بس جانا اس کا صحیح مفہوم ہے۔ اسی طرح نیچے آپ دیکھیں گے کہ شحّ کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی اس کے لیے خود غرضی کا لفظ تجویز کرتے ہیں۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ۔(النساء: 128)

"نفس تنگ دلی کے طرف جلدی مائل ہوجاتے ہیں"۔(سید مودودی)

"اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں"۔(فتح محمد جالندھری)

"طمع ہر ہر نفس میں شامل کردی گئی ہے"۔(محمد جوناگڑھی)

"طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوئی ہے"۔(امین احسن اصلاحی)

"خود غرضی نفوس میں رچی بسی ہے"۔(محمد امانت اللہ اصلاحی)

(540) ألم نستحوذ عليكم

قرآن مجید میں دو مقامات پر استحوذ مختلف صیغوں میں آیا ہے۔ درج ذیل آیت میں أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ کا مفہوم متعیّن کرنے میں مفسرین کو دشواری محسوس ہوئی ہے۔ کیوں کہ استحوذ کا مطلب غالب ہونا سمجھ لیا گیا۔ یہاں منافقین کا ذکر ہے اور منافقین تو مشرکین پر غالب ہوئے نہیں تھے۔ غالب ہونے کا مفہوم لینے کے بعد پر تکلف تاویلیں کرنی پڑتی ہیں۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی نے استحوذ کا مطلب حفاظت کرنا لیا ہے۔ اس مفہوم کو اختیار کرنے سے بات

واضح ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کو کبھی کچھ غلبہ ملنے کی صورت میں یہ ان سے کہتے کہ ہم نے تمھاری حفاظت کی اور مومنوں کو تم تک پہنچنے سے روکا۔

دراصل حوذ کے اصل معنی گھیر لینے کے ہوتے ہیں۔ گھیرابندی کبھی حفاظت کے لیے ہوتی ہے جیسے محافظین قائد کے گرد حفاظتی گھیرا ڈالتے ہیں اور کبھی کسی کو قابو میں کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

امام لغت خلیل فراہیدی لکھتے ہیں:

حوذ: حاذ يَحُوذ حَوْذاً، أي حاط يَحُوط حَوْطا۔(العين)

فیروزابادی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ لفظ حفاظت کا مفہوم بھی دیتا ہے:

الحَوْذُ: الحَوْطُ، والسَّوْقُ السَّريعُ، كالإِحواذِ، والمُحافَظَةُ على الشيءِ۔(القاموس المحیط)

امام خطابی نے ایک روایت کے حوالے سے اس مفہوم کو پیش کیا ہے:

وَقَالَ أَبُو سُلَيْمَانَ فِي حَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: "عَلَمُ الإِيمَانِ الصَّلاةُ فَمَنْ فَرَّغَ لَهَا قَلْبَهُ وَحَاذَ عَلَيْهَا بِحُدُودِهَا فَهُوَ مُؤْمِنٌ" حَدَّثَنِيهِ مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ يَعْقُوبَ الشَّافِعِيُّ ثنا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ نا مُحَمَّدُ بْنُ مُوسَى الْحَرَشِيُّ نا بَكْرُ بْنُ بَكَّارٍ نا حَمْزَةُ الزَّيَّاتُ نا أَبُو سُفْيَانَ عَنْ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ المشهور من هذا حافظ عليها فإن صحّ قولُه: حاذَ فمعناه ومعنى الأَوّل سواء يقال حاذ عَلَى الشيء إذا حافظ عليه۔(غریب الحدیث للخطابی)

اس وضاحت کی روشنی میں درج ذیل آیتوں کے ترجمے ملاحظہ ہوں:

(1)الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔(النساء:141)

"یہ منافق تمھارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے) اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟"۔(سید مودودی)

"وہ جو تمہاری حالت تکا کرتے ہیں تو اگر اللہ کی طرف سے تم کو فتح ملے کہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کا حصہ ہو تو ان سے کہیں کیا ہمیں تم پر قابو نہ تھا اور ہم نے تمہیں مسلمانوں سے بچایا"۔(احمد رضا خان)

"جو تم کو دیکھتے رہتے ہیں اگر خدا کی طرف سے تم کو فتح ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ اور اگر کافروں کو (فتح) نصیب ہو تو (ان سے) کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے اور تم کو مسلمانوں (کے ہاتھ) سے بچایا نہیں۔ تو خدا تم میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔ اور خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا"۔(فتح محمد جالندھری)

"یہ لوگ تمہارے انجام کار کا انتظار کرتے رہتے ہیں پھر اگر تمہیں اللہ فتح دے تو یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے

ساتھی نہیں اور اگر کافروں کو تھوڑا سا غلبہ مل جائے تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تمہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہ بچایا تھا؟”۔ (محمد جوناگڑھی)

”ان کو جو تمہارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کی کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں ؟”۔ (امین احسن اصلاحی، یہاں يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ صرف گردشوں کے منتظر ہونے کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کے انجام کا انتظار کرنے کے لیے ہے، وہ اچھا ہو یا برا ہو۔)

صاحب تدبر نے ترجمہ کیا ہے: ”کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے“۔ ان کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت کرنے کا مفہوم ان کے پیش نظر ہے۔

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی ترجمہ کرتے ہیں:

”یہ منافق تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں، اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے ؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تم کو اپنی حفاظت میں نہیں لیے رہے اور مومنین سے بچاتے رہے ؟”۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ المجادلۃ کی درج ذیل آیت میں اسْتَحْوَذَ کا مطلب غالب ہونا مان لیا گیا اور اسی بنا پر درج بالا سورۃ النساء کی آیت میں بھی اس لفظ کا ترجمہ غالب ہونا کیا گیا۔ حالاں کہ یہاں بھی غالب ہونا نہیں بلکہ گھیرے میں لینا مراد ہے۔

(2) اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُولَئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ۔ (المجادلۃ:19)

”شیطان اُن پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے خدا کی یاد اُن کے دل سے بھلا دی ہے وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں“۔ (سید مودودی)

”شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے۔ اور خدا کی یاد ان کو بھلا دی ہے۔ یہ (جماعت) شیطان کا لشکر ہے“۔ (فتح محمد جالندھری)

”ان پر شیطان غالب آ گیا تو انہیں اللہ کی یاد بھلا دی، وہ شیطان کے گروہ ہیں“۔ (احمد رضا خان)

یہاں غالب آنے کے بجائے مسلط ہونا اور قابو میں کر لینا زیادہ موزوں ترجمہ ہے۔ یہاں بھی اس لفظ کا اصل معنی یعنی گھیرا بندی کرنا مراد ہے۔ لیکن ایسی گھیرا بندی جس سے وہ اس کے دام میں آجائے۔ یعنی کوئی کشمکش یا جنگ نہیں تھی جس میں شیطان کو ان پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ بلکہ شیطان نے ان کی گھیرا بندی کر کے انھیں اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔

(541) وھو خادعھم

خدع کا معنی دھوکہ دینا ہوتا ہے اور غرّ کا معنی دھوکے میں ڈالنا ہوتا ہے۔ درج ذیل آیت میں خادعھم خدع

سے ہے جس کا مطلب دھوکہ دینا ہے نہ کہ دھوکے میں ڈالنا۔ اللہ نے اپنے لیے خادعھم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ عربی کا اسلوب ہے۔ ان کا عمل خدعة (دھوکہ دینا) ہے اور اللہ تعالی اس دھوکے کا توڑ کرتا ہے، اس مناسبت سے دھوکے کے توڑ کو بھی خدعة یعنی دھوکہ کہا گیا۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی متعدّد نظیریں ہیں۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔(النساء:142)

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کررہے ہیں حالانکہ در حقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے"۔ (سید مودودی)

"منافق (ان چالوں سے اپنے نزدیک) خدا کو دھوکا دیتے ہیں (یہ اس کو کیا دھوکا دیں گے) وہ انہیں کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے"۔ (فتح محمد جالندھری)

"بے شک منافق اللہ سے چالبازیاں کررہے ہیں اور وہ انہیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے"۔ (محمد جوناگڑھی، چالبازی کا بدلہ دینے والا لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ خادعھم کے مفہوم کی توجیہ ہے۔)

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں حالاں کہ در حقیقت وہی ان کو دھوکہ دے رہا ہے"۔ (محمد امانت اللہ اصلاحی)

(542) أن تجعلوا للہ

درج ذیل آیت کے ترجمے ملاحظہ فرمائیں:

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا۔(النساء:144)

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صاف حجت قائم کرلو"۔ (محمد جوناگڑھی)

"کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟"۔ (سید مودودی)

"کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا صریح الزام لو؟"۔ (فتح محمد جالندھری)

"کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کے لیے صریح حجت کرلو"۔ (احمد رضا خان)

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرالو"۔ (امین احسن اصلاحی)

مذکورہ بالا تراجم میں أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ کا دقیق ترجمہ نہیں کیا گیا۔ مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی ترجمہ تجویز کرتے ہیں:

"کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت فراہم کردو؟"

(543) وما قتلوہ یقینا

سوال یہ ہے کہ درج ذیل آیت میں یقیناً کا تعلق قتلوہ سے ہے یا ما قتلوہ سے؟

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا۔ (النساء:157)

”انھوں نے مسیح کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا“۔ (سید مودودی)

اس ترجمے سے مفہوم نکلتا ہے کہ انھیں شبہ ہے کہ انھوں نے قتل کیا یا نہیں کیا، وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے قتل کیا۔ یعنی یقینًا کا تعلق قتلوہ سے ہے۔

”اور اس کو مارا نہیں بے شک“۔ (شاہ عبدالقادر)

”اور بیشک انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا“۔ (احمد رضا خان)

ان ترجموں سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ان کا قتل کرنے کا دعوی یک سر غلط ہے اور انھوں نے یقینًا قتل نہیں کیا ہے۔ یعنی یقینًا کا تعلق ما قتلوہ سے ہے۔

یہ دوسرا مفہوم ہی زیادہ مناسب ہے۔ سیاق کلام اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن ان کے دعوے کی مکمل تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یقینًا انھوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا ہے۔

”قتل اس کو انہوں نے ہرگز نہیں کیا“۔ (امین احسن اصلاحی، یہاں ہرگز کا محل نہیں ہے، ہرگز سے یقینًا کے مفہوم کی ادائیگی نہیں ہوتی ہے۔)

(544) فبظلم من الذین ہادوا

یہاں ظلم نکرہ ہے اور عام ہے، اسی طرح الذین ھادوا بھی عام ہے۔ نہ کسی مخصوص ظلم کا ذکر ہے اور نہ یہود کے کسی مخصوص گروہ کا ذکر ہے۔ اس لیے ترجمہ پورے عموم کے ساتھ کرنا چاہیے۔

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِینَ ہَادُوا حَرَّمْنَا عَلَیْہِمْ طَیِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَہُمْ۔ (النساء: 160)

”سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں ان پر حرام کردیں“۔ (اشرف علی تھانوی)

”یہودیوں کے ایسے ہی مظالم اور زیادتیوں کی وجہ سے ہم نے وہ بہت سی پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کردیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں“۔ (محمد حسین نجفی)

”غرض اِن یہودی بن جانے والوں کے اِسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر“۔ (سید مودودی)

درج بالا دونوں ترجموں میں ظلم کی بے جا تخصیص کردی گئی۔

”پس ان یہودیوں کے ظلم کی بنا پر“۔ (ذیشان جوادی)

”پس ان یہود ہی کے ظلم کے سبب سے“۔ (امین احسن اصلاحی، 'ہی' کی ضرورت نہیں ہے)

درج بالا ترجموں میں یہود کی بے جا تخصیص کردی گئی۔

”پس یہودیوں کے ظلم کے سبب سے“۔ (محمد امانت اللہ اصلاحی)

(545) لٰکن الراسخون فی العلم منہم والمؤمنون

درج ذیل آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

لَكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (النساء: 162)

”مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی اِس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور روز آخر پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے“۔ (سید مودودی)

اس ترجمے میں کچھ کم زوریاں ہیں۔ الْمُؤْمِنُونَ کا ترجمہ ایمان دار کیا ہے۔ حالاں کہ اردو میں مومن کے لیے ایمان دار استعمال نہیں ہوتا ہے، ایمان والے کہا جاتا ہے۔

’اِس طرح کے ایمان لانے والے‘ یہ بھی اضافہ ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ایک اور کم زوری یہ ہے کہ ترجمے میں اصل جملے کے دروبست کی رعایت نہیں کی ہے۔ آخر میں أُولَئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا مستقل جملہ ہے، جب کہ ترجمے میں اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی ہے۔

”البتہ ان میں سے جو علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان دار ہیں، وہ سب اس پر ایمان لاتے ہیں، جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور وہ نماز کو قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم بہت بڑا اجر و ثواب عطا کریں گے“۔ (محمد حسین نجفی)

اس میں بھی الْمُؤْمِنُونَ کا ترجمہ ایمان دار کیا ہے۔

درج ذیل ترجمہ ان کم زوریوں سے خالی ہے:

”البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم دیں گے“۔ (امین احسن اصلاحی)

(546) وکلم اللہ تکلیماً

درج ذیل آیت میں تکلیما کا ترجمہ کرنے میں لوگوں نے الگ الگ راہیں نکالی ہیں:

کچھ ترجمے ملاحظہ فرمائیں:

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا۔ (النساء: 164)

”ہم نے موسیٰؑ سے اِس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے“۔ (سید مودودی)

”اور موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام کیا“۔ (محمد جوناگڑھی)

”اور اللہ نے موسیٰ سے اس طرح کلام کیا جیساکہ کلام کرنے کا حق ہے“۔ (محمد حسین نجفی)

”اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا“۔ (احمد رضا خان)

”اور موسیٰ سے تو خدا نے باتیں بھی کیں“۔ (فتح محمد جالندھری)

”اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا“۔ (امین احسن اصلاحی)

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی یہاں ترجمہ کرتے ہیں:

”اور اللہ نے موسی سے خصوصی گفتگو کی“۔

اسی سے ملتا جلتا درج ذیل ترجمہ ہے:

”اور موسیٰ سے اللہ تعالی نے خاص طور پر کلام فرمایا“۔ (اشرف علی تھانوی)

(547) لن یستنکف

فعل مضارع سے پہلے جب لن آتا ہے تو فعل مضارع مستقبل کا معنی دیتا ہے۔ درج ذیل آیت میں اکثر مترجمین نے ماضی اور حال کا ترجمہ کیا ہے:

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ۔ (النساء: 172)

”مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں“۔ (سید مودودی)

”مسیح اللہ کا بندہ بننے سے کچھ نفرت نہیں کرتا اور نہ مقرب فرشتے“۔ (احمد رضا خان)

”مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے (عار رکھتے ہیں)“۔ (فتح محمد جالندھری)

”نہ مسیح کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ بندۂ خدا ہیں اور نہ ملائکہ مقربین کو اس کی بندگی سے کوئی انکار ہے“۔ (ذیشان جوادی)

”عیسیٰ مسیح اللہ کا بندہ ہونے میں اپنے لیے عار نہیں سمجھتے اور نہ ہی مقرب فرشتے اس میں اپنے لیے کوئی عار محسوس کرتے ہیں“۔ (محمد حسین نجفی)

درج ذیل ترجمہ اس پہلو سے درست ہے:

”اور مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا“۔ (امین احسن اصلاحی)

(۲) اخبات

(خضوع و خشوع) دوسری صفت یا اخلاق۔ ان اہم بنیادی اخلاق میں سے اخبات یا خضوع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و نیاز مندی کا اظہار اور چشمِ دل کو اس کی طرف متوجہ رکھنا، اس کو اخبات کہتے ہیں۔ اخبات کا لفظ اور اسی طرح خضوع و خشوع قرآن پاک میں وارد ہوئے ہیں مثلاً اخبات جیسا کہ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واخبتوا الیٰ ربھم اولئک اصحاب الجنۃ ھم فیھا خالدون (آیت ۲۳)

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی کی، یہی لوگ جنت والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ نفوسِ سلیمہ جب ہر قسم کی تشویشاتِ طبعیہ اور خارجیہ سے فارغ ہوں اور ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال اور اس کی کبریائی ان کو یاد دلائی جائے اور کسی نہ کسی طرح ان کا رخ ادھر متوجہ ہو تو لا محالہ انہیں ایک ایسی حالت لاحق ہوگی جو حیرت اور دہشت کی جنس سے ہو سکتی ہے اور ایک خاص رنگ انہیں احاطہ کرے گا، اور جب یہ اس حالت سے نیچے اتر کر سفلی حالت کی طرف آتے ہیں تو یہی حیرت و دہشت خشوع و خضوع اور اخبات بن جاتا ہے اور ایسی حالت ان پر طاری ہوتی ہے جیسے غلاموں کی حالت اپنے آقاؤں کے سامنے یا کسانوں کی حالت بادشاہوں کے سامنے یا جیسا کہ محتاج سائل کی حالت سخی کریم کے سامنے ہوتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نفس کی یہ حالت ملاء اعلیٰ کے ساتھ مشابہ ہوتی ہے جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان جلال و کبریائی کے سامنے حیران و ششدر رہتے ہیں تو نفس کی یہ صفت خشوع خضوع اور مناجات میں ان ملاء اعلیٰ کے مشابہ ہوتی ہے۔

جب نفس اس کیفیت کے ساتھ رنگین ہو جاتا ہے اور یہ خصلت اس کے اصل کے جوہر میں داخل ہو جاتی ہے تو اس نفس اور ملاء اعلیٰ کے درمیان ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کی جانب سے اس نفس پر معارف جلیلہ مترشح ہوتے ہیں۔ ان معارف کی اشباہ و اشکال تجلیاتِ الٰہیہ ہوتی ہیں۔ شریعت نے اس صفت کو حاصل کرنے کے لیے خضوع و خشوع او رمناجات تلاوتِ قرآن کریم، ذکر، دعائیں اور تعویزات وغیرہ مقرر کیے ہیں۔

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اخبات کے اسباب یہ ہیں کہ انسان اپنے نفس کو تعظیم کے اعلیٰ حالات کا پابند بنائے جس قدر بھی اس سے ممکن ہو۔ مثلاً سرنگوں ہو کر کھڑا ہونا، سجدہ ریز ہونا اور ایسے الفاظ زبان سے بولنا جو اللہ تعالیٰ کے سامنے مناجات اور عاجزی پر دال ہوں اور اپنی تمام مناجات اس کے سامنے رکھنی، یہ تمام امور وہ ہیں جو نفس کو اخبات و موضوع کی صفت پر قوی درجہ کی تنبیہ کرتے ہیں۔

نیز امام ولی اللہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اخبات کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان سلیم الفطرۃ ہو اور تشویشات سے فارغ ہو تو جب اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی صفات و آیات کا تذکرہ کیا جائے اور گہرے طریق پر اس کو یاد کرے تو اس کا نفس ناطقہ متنبہ ہو گا اور اس کے حواس اور جسم میں انکساری و عاجزی پیدا ہو گی اور وہ حیران اور ماندہ یعنی تھکا ہوا ہو گا اور خطیرۃ القدس کی جانب اس کا میلان ہو گا اور ایک ایسی حالت اس پر طاری ہو گی جیسا کہ رعیت کے لوگوں کی اپنے بادشاہ کے سامنے ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنی لاچارگی، عاجزی اور نیازمندی اور ان بادشاہوں کا استبداد اور لینے دینے اور منع کرنے میں ان کا اختیار اور اپنی کمزوری ملاحظہ کرتا ہے۔ اور یہ حالت نسمہ کی حالتوں میں سے زیادہ اقرب حالت ہے ملاء اعلیٰ کے مشابہت میں، جس طرح ملاء اعلیٰ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے جلال میں حیران و سرگرداں ہوتے ہیں اور جس طرح اس کی تقدیس میں مستغرق ہوتے ہیں اور اسی لیے وہ ہمہ تن تیار ہوتے ہیں کہ ان کا نفس اپنے کمال علمی کی طرف خروج اختیار کرے اور معرفتِ الٰہیہ ان کے لوح و ذہن پر منتقش ہو اور وہ کسی نہ کسی طرح اس دربار میں سمجھتے ہیں اگرچہ الفاظ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

روحِ نماز، حضور مع اللہ اور جبروت کی طرف جھانکنا اور اللہ تعالیٰ کے جلال کو تعظیم و محبت اور اطمینان کے ساتھ یاد کرنا اور ان دعاؤں کے ساتھ جن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسنون قرار دیا ہے۔

اور تلاوتِ قرآن کی روح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف شوق، تعظیم اور محبت کے ساتھ متوجہ ہو اور قرآن کے مواعظ میں تدبر کرے اور اس کے احکام کے اِنقیاد میں پوری طرح شعور رکھتا ہو اور اِمتثال کے لیے آمادہ ہو اور اس کے امثال و قصص سے عبرت حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آیات کا ذکر جب اس کے سامنے آئے تو اس کی عظمت کا دل و زبان سے اظہار کرے اور جنت و رحمت کی آیات کے سامنے آنے سے اس کے فضل کا طلبگار رہو۔

اور روحِ ذکر یہ ہے کہ حضور اور استغراق سے جبروت کی طرف توجہ کرے اور اس سلسلہ میں تہلیل و تکبیر کہنے کی اس قدر مشق بہم پہنچائے کہ حجاب اٹھ جائے اور اس کو مکمل استغراق حاصل ہو جائے۔

اور روحِ دعا یہ ہے کہ ہر قسم کی طاقت اور برائی سے بچنے کی توفیق من جانب اللہ دیکھے اور خود ایسا ہو جائے جیسا میّت غسّال کے ہاتھ میں یا تصویر و عکس ہلانے والے اور حرکت دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مناجات

کی لذت بھی پائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جو اصول بیان فرمایا ہے کہ تہجد کے بعد نہایت ہی عاجزی سے اور گڑگڑا کر اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور پھر یہ شرط ہے کہ قلب بھی فارغ ہو، لہو ولعب میں مشغول اور غافل نہ ہو اور اس شخص کو بول و براز کا شدید تقاضا بھی نہ ہو اور غصے اور بھوک کی حالت میں بھی نہ ہو۔

جب انسان اس مناجات اور حاضری کی حالت کو پہچان لیتا ہے، پھر اگر اس حالت کو گم پاتا ہے تو اس کے اسباب کی کھوج لگاتا ہے، دریافت کرتا ہے۔ اب اگر طبیعت کی قوت اور شدت اس کا سبب ہو تو اس کا روزہ سے علاج کرنا چاہیے۔ اور اگر مادۂ شہوت کا غلبہ ہو تو اپنی ملکیت میں اس مادہ کا استغراق کرے۔ انہماک بھی مطلوب نہ ہو صرف علاج کے طور پر اس طریق کو استعمال کرے اور نیز کھانے پینے سے بھی فارغ ہو۔ اگر اس کا سبب ارتفاقات اور لوگوں کی رفاقت و صحبت ہو تو اس کا علاج کرے، ارتفاقات کے ساتھ عبادات کو بھی شریک کرے۔ اور اگر اس کا سبب فکر کے ظروف کا مشوش خیالات اور ردی افکار و وساوس سے پُر ہونا ہے تو پھر لوگوں سے الگ ہو جائے اور اپنے گھر یا مسجد کو لازم پکڑے اور اپنی زبان کو بجز اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دوسری باتوں سے روک دے اور اپنے قلب کو بجز اس فکر کے جو اس کی ضرورت کا ہو روک دے اور اپنے نفس کی نگرانی کرتا رہے۔ جب نیند سے بیدار ہو تو سب سے پہلے اللہ کا ذکر کرے اور جب سونے کے خیال سے الگ ہو تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اذکار و اوراد کا حکم دیا کہ جن سے دوامِ اخبات اور تضرّع حاصل ہوتا ہے۔

اور اسی طرح جو شخص صفتِ خضوع و اخبات سے آشنا نہ ہو بلکہ اس کی ضد کے ساتھ متّصف ہو تو جب ایسا شخص اس مادی عالم سے گزر جائے گا تو اس عالم میں تہہ بہ تہہ اوپر نیچے ظلمتیں اس پر ہجوم کریں گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جہاں جبروت کے انکشاف کا مُقتضی ہے اور یہ صفت جس کے ساتھ یہ شخص متّصف ہے یہ خشوع کے منافی ہے اور جبروت کے عدمِ انکشاف کو چاہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا اس کی وجہ سے اس شخص میں نفرت اور تنگی اس کے دل پر ہجوم کرے گی۔

انسان جب اپنے بڑے بزرگوں میں سے کسی کی تعظیم کرتا ہے مثلاً باپ دادا یا مرشد، استاد یا نیک دل امراء و ملوک وغیرہ تو اپنے دل ان کے پاس حاضر ہوتے وقت عاجزی پاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے وہ محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ کوئی بات کہیں حکم دیں تو میں اس کی تعمیل کروں اور اپنے دل میں ایک عجیب لذت۔۔۔۔ کسی انسان کو اس کا باپ کوئی کام دیتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو یقیناً اس کی اطاعت کرے گا اور اس کو اپنے رب کی اطاعت کا وسیلہ خیال کرے گا۔ جب یہ خصلتِ خضوع اس میں پختہ ہو کر ملکہ بن جائے تو اس کو یوں کہیں گے کہ اس کو اخبات کی خصلت حاصل ہو گئی ہے۔

اخبات کی مشق کرنے والا انسان ہمیشہ تعظیمی آداب کی پابندی اور حفاظت ہر حال میں لازم خیال کرے گا۔ مثلاً بول و براز کے وقت سر جھکا کر اور حیا سے بیٹھے گا اور ذکر کے وقت اپنے اطراف کو جمع کرے گا اور اس طرح ہر حال میں آداب کی پابندی کرتا رہے گا۔

مرویاتِ منافقین کی تحقیق: استفسار و جواب

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

سوال:

منافقین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے کام میں مسائل پیدا کیے۔ جب آنحضور دنیا سے تشریف لے گئے تو بعد میں ان منافقین نے دیگر مسائل پیدا کرنے کے ساتھ یہ بھی تو کیا ہوگا کہ آپ علیہ السلام کی طرف احادیث منسوب کی ہوں اور وہ احادیث ہماری کتب صحاح و دیگر کتب میں جگہ پا گئی ہوں۔ چونکہ یہ لوگ نبی کریم کے زمانہ کے تھے، اس وجہ سے ان کی بات ہاتھوں ہاتھوں لی جاتی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ، صحابہ کرام کی جماعت میں شامل تھے جن کی بات بعد میں آنے والوں کے لیے حجت ہے، اس لیے ان کی بات لکھ لی گئی ہوگی۔ کیا ایسا ممکن تھا؟ اگر ممکن تھا تو علمائے حدیث نے اس کی تحقیق کیسے کی؟

جواب:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منافقین یقیناً مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے، لیکن یہ امکان کہ انھوں نے اپنی طرف سے کچھ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں میں پھیلا دی ہوں، تاریخی طور پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حقائق پیش نظر رہنے چاہییں۔

ا۔ مسلمانوں کا دین اساسی طور پر علم العامۃ کے طور پر تاریخ میں محفوظ کیا گیا ہے، چنانچہ دین کی کوئی اساسی تعلیم ایسی نہیں جو کسی خبر واحد پر منحصر ہو۔ مسلمانوں کا دین اصلاً قرآن مجید اور سنت متواترہ کی صورت میں ہے جو نبی علیہ السلام کے دور سے ہی مسلمانوں کے عمومی اتفاق سے امت کو نسل در نسل نقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اخبار آحاد میں ذیلی اور فروعی نوعیت کی توضیحات بیان ہوئی ہیں جنھیں قطعی اور متواتر دین کی روشنی میں جانچ پرکھ کر ہی قبول کیا جاتا ہے۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ذخیرہ بنیادی طور پر جن اکابر صحابہ سے مروی ہے، ان کے ایمان کی صحت کی واضح گواہی احادیث میں موجود ہے۔ غیر معروف صحابہ جن کے احوال کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہ ہوں، بہت کم ہیں اور ان سے منقول روایات بھی معدودے چند ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذخیرہ حدیث کے کم وبیش نوے سے پچانوے فی صد حصے میں اس خدشے کا امکان نہیں کہ اس میں عہد نبوی کے منافقین نے کوئی دراندازی کی ہو یا اپنی طرف سے کچھ باتیں اس میں شامل کر دی ہوں۔

۳۔ عہد نبوی کے سرکردہ منافقین کا راز عمومی طور پر فاش نہیں کیا گیا تھا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ مثلاً حضرت حذیفہؓ کو ان کے ناموں سے باقاعدہ آگاہ کر دیا تھا۔ یہ بارہ افراد تھے جن پر حضرت حذیفہ کی نظر رہتی تھی۔ چنانچہ وہ ان کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے اور لوگوں کو یہ بھی بتاتے رہتے تھے کہ اب ان میں سے کتنے افراد زندہ باقی ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ ان میں سے چار لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان افراد کی سرگرمیوں پر اور خصوصاً ان کی بیان کردہ باتوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہوگی اور اگر وہ کوئی ایسی بات حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے جس کا مضمون مشتبہ ہوتا تو یقیناً حضرت حذیفہؓ اس کے متعلق لوگوں کو خبردار کر دیتے۔

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے کسی غیر معروف یا غریب بات پر کھٹک محسوس کرنے اور اس کی تحقیق وتفتیش کرنے کا رجحان بھی عہد صحابہ میں عام تھا اور اکابر صحابہ کسی غیر معروف بات کو اور خصوصاً کسی ایسی بات کو جو دین کے معروفات سے ٹکرا رہی ہو، قبول نہیں کرتے تھے۔ اس تناظر میں بھی یہ امکان بہت ہی نادر ہو جاتا ہے کہ کسی شخص نے کوئی ایسی بات گھڑ کر رسول اللہ کی نسبت سے مسلمانوں میں عام کر دی ہو جو بالکل ہی بے اصل ہو اور اس کی چھان پھٹک کرنا راوی کے ظاہری اعتماد کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ناممکن بن گیا ہو۔

بچوں سے قرآن حفظ کرانا

ڈاکٹر عرفان شہزاد

عہدِ رسالت سے قرآن مجید حفظ و تحریر دونوں طریقوں سے محفوظ اور منتقل کیا گیا۔ صحابہ اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق قرآن مجید مکمل یا جزواً یاد کر لیتے تھے۔ لیکن رسمی حفظِ قرآن اور بچوں کو بالجبر قرآن یاد کرانے کا کوئی تصور نہ تھا۔

تاہم، مسلمانوں کو ایک طویل عرصے سے یہ باور کرایا گیا ہے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کی بہترین عمر بچپن کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک حافظِ قرآن اپنے خاندان کے دس ایسے افراد کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔ [1] حافظِ قرآن کے والدین کو روزِ قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی روشنی سے بھی زیادہ ہو گی [2]۔ ان ترغیبات کے زیر اثر والدین یہ سعادت حاصل کرنے اور جہنم سے بچنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے بچوں کو قرآن حفظ کرانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ گلی، محلوں، گاؤں اور شہروں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے حفظِ قرآن کے مدارس ایسے ہی بچوں سے آباد اور ایک بڑے طبقے کے معاش کا ذریعہ ہیں۔

حفظِ قرآن سے متعلق محولہ بالا روایات ضعیف ہیں اور دین کے مسلّمہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں۔ قرآن مجید ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے [3]، وہ بتاتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کوئی کسی دوسرے کے کام نہیں آئے گا، وہاں بغیر میرٹ کے کسی کی سفارش نہیں کی جا سکے گی۔ [4]

مگر والدین ان بر سر خود غلط ترغیبات سے متاثر ہو کر اپنے کم سن بچوں کو زبردستی حفظ کرانے کے لیے کسی مدرسے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ بلکہ ترجیحاً اپنے گاؤں، محلے اور گھر سے دور کسی مدرسے میں داخل کراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے علاقے اور گھر کے قریب کے مدرسے میں بچے کی توجہ اپنے خاندان اور دوستوں سے ملنے کی تڑپ میں منتشر رہتی ہے، چناں چہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسے ان سب سے دور بھیج دیا جائے، جہاں وہ کوئی شناسا نہ پائے اور پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

والدین کی شفقت اور احساسِ تحفظ سے محروم ہو جانے کے بعد ایک اجنبی ماحول میں بچہ جس جذباتی المیے سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچپن کے لاابالی پن سے لطف اندوز ہونے کی عمر ایک سخت روٹین کے شکنجے میں پھنس جاتی ہے۔ ایک محدود ماحول میں مقیّد ہو جانے سے معاشرتی رویے سیکھنے کے مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ مختلف عمر اور مزاج کے لڑکوں اور اساتذہ کے درمیان اس کی معصومیت بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بچہ جتنا کم عمر، خوش شکل اور والدین کی خبر گیری سے دور ہوتا ہے، اس کے استحصال کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی۔ انھیں خبر کی گئی، وہ آئے مگر بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے اسے تسلی دے کر پھر اسی مدرسے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظِ قرآن مکمل کرائے بغیر وہ اسے واپس لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے لیے ایسے حادثات غیر متوقع نہیں تھے۔ ان خدشات کو گوارا کرتے ہوئے ہی وہ اپنے کم سن بچوں کو اجنبی ماحول کے سپرد کر آتے ہیں۔

بچے سے قرآن حفظ کروانے کے لیے والدین نہ صرف خود اس پر تشدد کرتے ہیں بلکہ اساتذہ کو بھی اس کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بے اصل روایت بھی مشہور کرا رکھی ہے کہ جسم کے جس حصے پر استاد کی مار پڑتی ہے اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ تشدد کی صورت میں بچہ اگر زخمی ہو جائے یا، خدانخواستہ، اس کی موت واقع ہو جائے تو والدین عموماً استاد کو معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق بچہ خدا کی راہ میں شہید ہو گیا۔ یوں والدین کی آخرت سنور گئی۔ یہی نصب العین تھا جو قبل از وقت حاصل ہو گیا۔ اس "خدمت" کے عوض استاد کو سزا کیوں دی جائے؟ سزا سے مامونیت کی یہ توقع تشدد پسند طبائع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

کچھ بچوں میں اتنی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ پورا قرآن یاد کر سکیں۔ راقم کے تجربے میں ایسے والدین بھی آئے جنھیں بتایا گیا کہ ان کا بچہ حفظ نہیں کر سکتا، لہٰذا اسے مجبور نہ کیا جائے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بضد رہے کہ بچے کو ہر صورت حفظ کرایا جائے۔ ان کے مطابق، حفظ کرنے کی محنت سے دماغ تیز ہو جاتا ہے۔

ایسے بچوں کو برسوں حفظ کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔ سبق یاد نہ کر سکنے کی پاداش میں مار پیٹ اور ذلت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہم سبق بچوں کے سامنے وہ نکّو بن کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، اسی وجہ سے ان کی یادداشت کام نہیں کر رہی۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ حافظ کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ شیطان لگے ہوتے ہیں جو اسے حفظ کی سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورت حال کسی اذیت گاہ (ٹارچر سیل) سے کم نہیں ہوتی، جہاں بچہ ہر صبح یہ سوچ کر اٹھتا ہے کہ تشدد اور ذلت کا ایک اور طویل دن اس کا منتظر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک گناہ گار شخص ہے جس سے اس کے والدین راضی ہیں نہ اساتذہ اور نہ ہی خدا۔ ہم مکتب ساتھیوں کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ بچے مدرسے اور گھر سے بھاگ

جاتے ہیں تو پکڑ پکڑ کر لائے جاتے ہیں اور بھاگنے پر تشدد اور ذلت الگ سہتے ہیں۔ ان کی عزتِ نفس ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر منفی نفسیات میں جیتے ہیں۔ یہ نفسیات ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیتی ہے اور مختلف منفی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بہت سے طلبہ میں انھی وجوہات سے قرآن مجید سے بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات کے مطابق، خدا کا پہلا تصور والدین سے ملے تاثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں اساتذہ کی شخصیت کے تاثرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم اور اساتذہ کی سختیوں سے گھائل ان بچوں میں خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ توحُّش کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لینے کے بعد وہ خدا کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ والدین سے ناراض ہوتے ہیں مگر ان کی ناراضی سے ڈرتے بھی ہیں۔ یہی نفسیات خدا کے ساتھ ان کے تعلق میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ خدا سے محبت نہیں کر پاتے، لیکن اس سے ڈر کے احساس کے تحت اس کی رسمی اور قانونی قسم کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی نفسیات لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عام طور پر خوف دلاتے اور جبر اور دھونس سے بات منواتے نظر آتے ہیں۔

بچہ ہو یا بڑا اس کی مرضی کے بغیر اسے کسی ایسی ذہنی یا جسمانی مشقت میں مبتلا کرنا جس کا مطالبہ دین اور عقل نہیں کرتے، اس کا استحصال ہے۔ حفظِ قرآن ان بنیادی مہارتوں کی تعلیم نہیں ہے جن کا سیکھنا ناگزیر ہوتا ہے اور اس بنا پر انھیں بچپن میں بالجبر بھی سکھایا جاتا ہے، جیسے لکھنا پڑھنا، ابتدائی ریاضی وغیرہ۔

دس سے بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم پانا تعلیمی رجحان رکھنے والے ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ اس کے بعد اس کا خصوصی رجحان دیکھ کر فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ اسے کس طرح کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ حفظ قرآن ایک تخصیصی تعلیم ہے، یہ فرد کی مرضی اور رجحان جانچے بنا بچپن میں نہیں دلائی جا سکتی۔ یہ اپنے ذوق، صلاحیت اور شعوری انتخاب کا معاملہ ہے، جو شعور کی عمر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مریم علیہا السلام کی پیدایش سے پہلے ان کی والدہ کا انھیں خدا کے نام پر وقف کر دینے کے واقعے سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ والدین کو بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا مطلق حق حاصل ہے۔ مریم علیہا السلام کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو دین کی خدمت کے لیے خدا کے نام پر وقف کر دیں۔ قرآن مجید میں ان کی دعا اسی خواہش کا اظہار ہے۔[5] مگر مریم علیہا السلام پر اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کی کوئی پابندی نہیں تھی جس کی خواہش اور دعا ان کی والدہ نے کی تھی۔ ایسے ہی جیسے بچپن میں طے کیے گئے نکاح کو قبول کرنے کی پابندی بچوں پر نہیں ہوتی۔ وہ شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچ کر رشتے سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مریم علیہا السلام کی اپنی طبیعت بھی اسی کام کی طرف مائل رہی جس کی خواہش ان کی والدہ نے کی تھی۔ یوں ان کی دعا پوری ہوئی۔

پھر یوں نہیں ہوا کہ مریم علیہا السلام کے پیدا ہوتے ہی انھیں دین کے خدّام کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔ تاہم، یہ اقدام ان کی شعور کی عمر کے بعد ہی کیا گیا ہوگا۔ اصولی طور پر اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اس پر من وعن عمل کرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی رائے لی، اور بیٹے کی رضامندی کے بعد ہی اقدام کیا۔

دینی مدارس میں رائج حفظِ قرآن کی کلاس کا طویل دورانیہ بچوں پر سخت گراں بار ہوتا ہے۔ اس سرگرمی میں تنوع نہیں ہوتا کہ بچہ یکسانیت کی بوریت سے نجات پا سکے۔ زبانی یاد کرنے کی ایک ہی سرگرمی اتنے طویل دورانیے تک کرتے چلے جانا، ایک غیر صحت مند طریقۂ تعلیم ہے۔

کچھ بچوں کو اسکول سے ہٹا کر حفظ کرانے بٹھا دیا جاتا ہے۔ حفظ کے بعد انھیں دوبارہ سکول میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ سکول کی تعلیم کا حرج کم کرنے اور قرآن کا حفظ جلد مکمل کرانے کی خاطر بچے کا زیادہ سے زیادہ وقت حفظ قرآن میں لگایا جاتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہوتا ہے۔ اس سے بدتر پریکٹس یہ ہے کہ اسکول کے ساتھ حفظ بھی کرایا جاتا ہے۔ یوں بچے والدین کی دوطرفہ خواہشوں کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اپنا بچپن جینے کا پورا موقع ہی نہیں ملتا۔

کم سن بچوں کا زیادہ وقت کھیل کود میں بیتنا چاہیے۔ ایسی ہر تعلیمی سرگرمی جس کے اوقات کھیل کے اوقات سے زیادہ ہوں، بچوں کا استحصال ہے۔ بچوں کی یہ عمر کھیل کھیل میں سیکھنے، خود کھوجنے اور سوالات کرنے کی ہے۔ لاابالی پن کی اس حسین عمر کو ایک سخت اور خشک روٹین کی نذر کرنا بچے کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

ایک بار یاد کر لینے کے بعد قرآن مجید کو مستقلاً یاد رکھنا ایک مسلسل محنت طلب کام ہے۔ شعبۂ حفظ سے منسلک حفاظ کسی حد تک قرآن یاد رکھ پاتے ہیں، مگر عام حفاظ جو عملی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے لیے قرآن کو یاد رکھنا بے حد مشکل رہتا ہے۔ ان کی اکثریت بڑی عمر میں پورا قرآن یاد نہیں رکھ پاتی۔ ان کا حفظِ قرآن خود ایک یادگار بن کر رہ جاتا ہے۔

ادھر قرآن کے بھلا دینے پر بعض روایات میں وارد ہونے والی وعیدیں بھی بتائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے پورا قرآن یاد نہ رکھ سکنے والے حفاظ احساس جرم کا شکار رہتے ہیں۔ تاہم، قرآن کو بھلا دینے پر سخت سزاؤں کی وعید بتانے والی روایات ضعیف ہیں۔[6]

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”میری امت کے اعمال کا ثواب مجھ پر پیش کیا گیا، حتیٰ کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے (اس کا ثواب بھی لکھا ہوا تھا)، اور میری امت کے گناہ بھی مجھ پر پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت عطا

کی گئی اور اس نے (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید سے بے اعتنائی برتنا بڑی محرومی کی بات ہے۔ لیکن قرآن کو زبانی یاد رکھنا دین کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

حفظِ قرآن کی حقیقت و حیثیت

عہدِ رسالت میں متنِ قرآن کی کتابت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اشاعت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی درپیش تھی کہ عرب معاشرت میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا۔ کتابت کے ذرائع بھی عام میسر نہ تھے۔ رسم الخط بھی اس درجہ ترقی یافتہ نہ تھا کہ بغیر قراءت کے متن کی درست پڑھائی ہر ایک کے لیے ممکن ہوتی۔ قرآن مجید سب کو لکھ کر دے بھی دیا جاتا تو بھی یہ ممکن نہ تھا کہ سب اسے دیکھ کر پڑھ سکتے۔ وسیع پیمانے پر قرآن مجید کی حفاظت، تلاوت اور اس کی تعلیم و ترسیل کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

صحابہ کے ہاں بغیر سمجھے قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عربی ان کی اپنی زبان تھی اس لیے بنا سمجھے پڑھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انھیں قرآن پڑھنے یا یاد کرنے کا کہا گیا تو اس سے قرآن مجید کی بے سمجھ تلاوت یا حفظ مراد لینے کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی۔ بعد میں عجمی اقوام جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں، تو پہلی بار ان کے ہاں بے سمجھ تلاوت اور حفظ کا آغاز ہوا۔ قرآن مجید کے متن کی قراءت سیکھنا پہلا کام تھا۔ اس کے بعد انھیں اس کے فہم کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ کسی دوسری زبان کی کتاب پڑھنے میں یہی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔ مگر سستی یا بے توجہی کی وجہ سے ان کی اکثریت نے ناظرہ قرآن پر اکتفا کر لیا۔ اس کوتاہی کا جب عام رواج ہو گیا تو اس کے لیے سندِ جواز اختراع کر لی گئی۔ اِس نئے طرز کے حفظ و قراءت کو اُس تلاوت اور حفظ کا مترادف باور کرایا گیا جس کی ترغیب احادیث میں وارد ہوئی تھی۔ امام ابو بکر الطرطوشی[7] نے بجا طور پر بے سمجھ حفظ کے اس طرز عمل کو بدعت قرار دیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

"ومما ابتدعه الناس في القرآن، الاقتصار على حفظ حروفه دون التفقُّه فيه۔"[8]

قرآنِ مجید کے متعلق لوگوں کی ایک بدعت قرآن کے فہم و تفقہ کو چھوڑ کر محض اس کے الفاظ کو حفظ کرنے پر اکتفا کر لینا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اور بے سمجھے پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

{كتاب أنزلناه إليک مبارک ليدبروا آياته وليتذكر أولو الألباب}
(القرآن، 38: 29)

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف نازل کی ہے۔ اِس لیے کہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور اِس لیے کہ عقل والے اِس سے یاددہانی حاصل کریں۔

{أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها} (القرآن، 47: 24)

سو کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر اُن کے تالے چڑھے ہوئے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر ڈالا اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں۔

روایت یہ ہے:

لم يفقه من قرأ القرآن فى أقل من ثلاث[9]

اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر ڈالا۔

عجیب بات ہے کہ اس روایت کی بنا پر قرآن مجید کو تین دن سے کم میں ختم نہ کرنے کی طرح تو ڈالی گئی، مگر روایت کا اصل مقصود، یعنی بے سمجھ تلاوت کی حوصلہ شکنی، اسے باور ہی نہیں کیا گیا اور بے سمجھ تلاوت اور حفظ کو باعث اجر سمجھ لیا گیا!

قراء کے ہاں یہ طریقہ بھی اپنایا گیا کہ کسی آیت کو ادھورا نہ پڑھا جائے۔ پڑھتے ہوئے سانس درمیان میں ٹوٹ جائے تو آیت کو کچھ پیچھے سے دہرا کر اسے مکمل کیا جائے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ آیت کا ادھورا مطلب ادا نہ کیا جائے۔ مگر آیت کا مطلب ہے کیا؟ اس کی طرف التفات نہ ہونے کو بھی جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ لیا گیا۔

ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ الف، لام، میم کی تلاوت پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ اس روایت سے بے سمجھ تلاوت وحفظ کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔[10] استدلال یہ ہے کہ الف، لام۔ میم کا معنی معلوم نہیں، پھر بھی ان کی تلاوت پر ثواب ملتا ہے۔ اس لیے بے معنی تلاوت بھی اجر کا باعث ہے۔

یہ روایت مستند نہیں۔ تاہم، اگر اس کی صحت پر کسی درجے میں اطمینان ہو بھی جائے[11] تو بھی اس کا اسلوب تلاوت کی ترغیب دینے کا ہے نہ کہ بے سمجھ تلاوت کی ترغیب دینے کا۔ الف-لام-میم کے اجر کا بیان، ثواب کا حجم بتانے کے لیے بطور مثال ذکر ہوا ہے۔ یہ بات کسی طرح معقول نہیں کہ کسی بامعنی کتاب کو بے سمجھے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ خصوصاً قرآن مجید جیسی کتابِ ہدایت کے حق میں یہ تصور بالکل بے جا ہے۔ پھر یہ ترغیب ان لوگوں کو کیسے دی جا سکتی ہے جن کے لیے قرآن مجید ان کی اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے بے سمجھے پڑھنا ممکن ہی نہ تھا؟

محولہ بالا مفہوم کی تمام روایات میں سے کوئی روایت بھی سنداً صحیح یا حسن کے درجے کی نہیں کہ کسی درجے میں بھی بنائے استدلال بنائی جا سکے۔ تاہم، انھی روایات میں سے بعض متون میں وہ پوری بات بھی بیان ہوئی ہے جو دین اور عقل دونوں کے مطابق ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ اجر محض بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے پر نہیں، بلکہ قرآن مجید پر غور و فکر کرنے، اسے سیکھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے کے مجموعی کام پر بتایا گیا ہے۔

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

تعلموا القرآن، واتلوه تؤجروا بكل حرف عشر حسنات، أما إني لا أقول: {الم} [البقرة: 1]، ولكن ألف، ولام، وميم[12]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن مجید کو سیکھو، سمجھو اور اسے پڑھو، تمھیں ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔ یاد رہے میں یہ نہیں کہتا الم (ایک حرف ہے)، بلکہ الف، لام اور میم (الگ الگ حرف) ہیں (یعنی تین حروف ہیں)۔"[13]

احادیث میں وارد ہونے الفاظ "حاملِ قرآن" اور "صاحب قرآن" کا مصداق بھی غلط طور پر اس حافظ کو قرار دے دیا گیا جسے قرآن مجید کے معنی و مفہوم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ تاہم، اس روایت میں بھی یہ القابات اس شخص کے لیے بیان ہوئے ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھتا، اس پر عمل کرتا، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے، یہ شخص ظاہر ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے والا ہی ہو سکتا ہے۔

روایت یہ ہے:

لحامل القرآن إذا أحل حلاله، وحرم حرامه أن يشفع في عشرة من أهل بيته، كلهم قد وجبت له النار (المعجم الأوسط، 5258)[14]

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

فہمِ قرآن محض طبقہ علما کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ قرآن مجید کے فہم کے مختلف درجات ہیں اور ہر فرد اپنی بساط کے مطابق اس میں سے حصہ وصول کرتا ہے۔ فہمِ قرآن کا ایک دائرہ اعلیٰ سطحی اور فنی نوعیت کا ہے، جو مخصوص علمی ذوق رکھنے والی ذہانتوں کا میدان ہے۔ تاہم، قرآن مجید کا عام فہم بھی مطلوب ہے۔ یہ تذکیر اور تزکیہ کے حصول کے لیے ہے، اور تذکیر و تزکیہ ہی قرآن مجید کا اصل مقصود ہے۔ قرآن مجید کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے اور یہ بہت سادہ اور واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس کے لیے کسی اعلیٰ لسانی اور علمی مہارت کی ضرورت نہیں۔

قرآن مجید کے محفوظ ہو جانے کے قابل اعتماد ذرائع میسر آ جانے کے بعد اس کی حفاظت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کی وہ اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ تاہم، یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی حفاظت میں کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہ رہے اور اس کے لیے حفاظ کی ایک بڑی تعداد دنیا میں موجود رہنی چاہیے، جن کی اجتماعی یادداشت میں پورا قرآن محفوظ رہے۔ قرآن کی حفاظت کا یہ ایسا ذریعہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اپنے ذوق اور عبادت میں حلاوت پانے کے لیے قرآن مجید جزوی طور پر یا مکمل حفظ کرنا بھی بڑی سعادت کی بات ہے۔ مگر یہ ذاتی انتخاب کا معاملہ ہے جو سنِ شعور سے پہلے نہیں کیا جا سکتا۔

بچوں سے قرآن حفظ کرانے کا بہرحال، کوئی جواز نہیں۔ دین کے نام پر یا آخرت کے مزعومہ تحفظ کی خاطر بچوں پر ان کی مرضی کے بغیر، ایسی مشقت مسلط کرنا جس کا حکم یا مطالبہ خدا نے نہیں کیا، ان کا استحصال ہے۔ یہ ہرگز ثواب کا کام نہیں۔۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بچوں کو تختۂ مشق بنانا زیادتی ہے اور خدا کے ہاں ہر ظلم و زیادتی کا حساب لیا جائے گا۔

حواشی

(1) لحامل القرآن إذا أحل حلاله، وحرم حرامه أن يشفع فی عشرة من أہل بیته، کلهم قد وجبت له النار (المعجم الأوسط، 5258)

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

اسے علامہ البانیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم: 4662)

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

من قرأ القرآن واستظهره فأحل حلاله وحرم حرامه أدخله الله به الجنة وشفعه فی عشرة من أہل بیته کلهم قد وجبت له النار (الترمذی: 2905)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانیؒ نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعیف الترمذی، رقم: 2905)

(2) حدثنا أحمد بن عمرو بن السرح، أخبرنا ابن وهب، أخبرنی یحیی بن أیوب، عن زبان بن فائد، عن سهل بن معاذ الجهنی، عن أبیه، أن رسول الله صلى الله علیه وسلم قال: «من قرأ القرآن وعمل بما فیه، ألبس والداه تاجا یوم القیامة، ضوءه أحسن من ضوء الشمس فی بیوت الدنیا لو کانت فیکم، فما ظنکم بالذی عمل بهذا؟ (مشکاۃ المصابیح: 2139)

معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن پڑھا اور اس کی

تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہوگی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمہارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہو گا"۔ (علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔) (مشکاۃ المصابیح، رقم: 2139)

(3) {كل نفس بما كسبت رهينة} [القرآن، 74: 38]

ہر متنفس (اس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہو گا۔

(4) واتقوا يوما لا تجزى نفس عن نفس شيئا ولا يقبل منها شفاعة ولا يؤخذ منها عدل ولا هم ينصرون (القرآن، 2: 48)

اور اس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔

(5) إذ قالت امرأت عمران رب إني نذرت لک ما فی بطنی محررا فتقبل منی ۚ إنک أنت السميع العليم (آل عمران، 3: 35)

انھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے۔ سو تو میری طرف سے اس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔

(6) مثلاً درج ذیل روایت دیکھیے:

وعن أنس بن مالک قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «عرضت على أجور أمتى حتى القذاة يخرجها الرجل من المسجد وعرضت على ذنوب أمتى فلم أر ذنبا أعظم من سورة من القرآن أو آية أوتيها رجل ثم نسيها». رواه الترمذى وأبو داود (مشكاة المصابيح، 720)

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے:

رواه الترمذى (2916 وقال: غريب) و أبو داود (461). ابن جريج مدلس ولم يسمع من مطلب شيئا والمطلب: لم يسمع من سيدنا أنس رضى الله عنه.

https://islamicurdubooks.com/ur/hadith/hadith-.php?bookid=23&hadith_number=720

اس مفہوم کی درج ذیل روایت بھی ضعیف ہے۔

وعن سعد بن عبادة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ما من امرئ يقرأ القرآن ثم ينساه إلا لقى الله يوم القيامة اجذم». (رواه ابو داود والدارمى)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص قرآن پڑھتا ہو لیکن پھر وہ اسے بھول جائے تو وہ روز قیامت

حالت کوڑھ میں اللہ سے ملاقات کرے گا۔"

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو بھی ضعیف قرار دیا ہے:

یزید بن أبی زیاد: ضعیف و عیسی بن فائد: مجھول، ولم یسمعہ من سعد، بینھما رجل مجھول

https://www.islamicurdubooks.com/hadith/hadith-.php?hadith_number=2200&bookid=23&tarqeem=1

(7) مالکی فقیہ اور حافظ، المتوفی: 250 ھجری

(8) ابو بکر الطرطوشی، الحوادث والبدع، ناشر: دار ابن الجوزی، الطبعۃ: الثالثۃ، 1419 ھ - 1998 م، ص: 101

(9) ترمذی، رقم: 2949، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (صحیح وضعیف سنن الترمذی، 2949)

(10) من قرأ حرفا من کتاب اللہ فلہ بہ حسنۃ، والحسنۃ بعشر أمثالھا، لا أقول الم حرف، ولکن ألف حرف ولام حرف ومیم حرف۔ (سنن الترمذی، 2910)

امام ترمذی نے اس حسن صحیح غریب قرار دیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح بتایا ہے (صحیح وضعیف سنن الترمذی، 2910)۔ تاہم، اس کی سند پر کلام قابل لحاظ ہے جو آگے آتا ہے۔

(11) یہ مضمون کل دو صحابہ سے مروی ہے، ایک عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، دوسرے عوف بن مالک الاشجعی۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے محمد بن کعب روایت کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود کا انتقال 33 ہجری میں ہوا اور محمد بن کعب کی پیدائش 38 یا 40 ہجری کی ہے، لہذا دونوں میں لازما انقطاع ہے اس لیے اس سند سے منقول ساری روایات ضعیف ہیں۔ (التفسیر من سنن سعید بن منصور - محققا (29/1) عوف بن مالک ایک دوسرے صحابی ہیں، ان سے بھی محمد بن کعب ہی روایت کرتے ہیں، یہاں انقطاع کا مسئلہ نہیں کیونکہ عوف بن مالک کی وفات 73 ہجری میں ہوئی ہے، لیکن اس سلسلے کی تمام روایات ایک دوسرے راوی، موسی بن عبیدۃ الربذی کے باعث شدید ضعیف ہیں۔ (الذھبی، دیوان الضعفاء، رقم: 4293، ص: 402)۔ مثلا دیکھیے، مصنف ابن ابی شیبۃ، رقم: 29933

(12) التفسیر من سنن سعید بن منصور – مخرجا، 35/1، ص 6

(13) مستفاد از تحقیق جناب محمد حسن الیاس، ""قرآن مجید کی تلاوت، ہر لفظ پر دس نیکیاں"

https://www.facebook.com/100064626491667/posts/1889002831463250/

(14) علامہ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم: 4662)

بالآخر وہائٹ ہاؤس کے ”شیاطینِ بزرگ“ سے ہری جھنڈی ملنے کے بعد اسرائیل نے لبنان پر فضائی اور بری حملہ کر دیا۔ جس میں 28 ستمبر کی رات کو ضاحیۃ بیروت میں امریکہ کے فراہم کردہ ۸۰ بنکر بسٹر بموں سے چھ عمارتوں پر مشتمل ایک بڑے کمپاؤنڈ کو پوری طرح زمین دوز کر دیا گیا اور اس میں حزب اللہ کے سربراہ شیخ حسن نصر اللہ اور اس کی ٹاپ قیادت شہید کر دی گئی۔ یہ کئی افراد تھے جن میں بعض ایرانی کمانڈر بھی تھے جو وہاں حملے کے وقت موجود تھے اور میٹنگ کر رہے تھے۔ جنوبی لبنان اور دارالحکومت بیروت کے مضافات تک کے رہائشی علاقوں میں اسرائیل نے ایک ہی رات میں 1300 سے زاید ہوائی حملے کیے۔ جن میں ایک ہی دن میں چھ سو سے زیادہ شہری مارے گئے۔ انفرااسٹرکچر تباہ ہوا اور لاکھوں لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑ رہی ہے۔ زخمی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

تب سے اسرائیل کے حملے مسلسل جاری ہیں اور اب اس نے زمینی حملے بھی کر دیے ہیں جن کا حزب اللہ کے مجاہد بھرپور جواب دے رہے ہیں۔ بظاہر اسرائیل یہ دعوا کرتا ہے کہ اُس نے صرف حزب اللہ کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا ہے۔ مگر امریکہ اور اسرائیل دونوں کا طریقۂ واردات جنگ میں زیادہ سے زیادہ شہریوں کو ہلاک کرنے اور انفرااسٹرکچر کی زیادہ سے زیادہ تباہی پر مبنی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دشمن جلدی گھٹنے ٹیک دے گا۔

اسرائیل کا ماننا ہے کہ اس ہتھ کنڈے سے لبنان کے عوام خود حزب اللہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے مگر ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہی اندازہ اس کا غزہ کے بارے میں بھی تھا لیکن سال بھر سے زیادہ شدید اور ناقابل برداشت اذیتوں سے گذرنے کے باوجود غزہ کے عوام نے اس کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

لبنان پر اپنے حملوں کا آغاز اسرائیل نے پیجر اور واکی ٹاکی دھماکوں سے کیا جس کی پلاننگ ظاہر ہے کہ بہت پہلے سے کی گئی ہوگی، اور اس میں امریکی انٹیلیجنس اور تائیوان وغیرہ کی کمپنیوں کا ملوث ہونے کا بڑا امکان ہے۔ اِن پیجر دھماکوں میں حزب اللہ کے بہت سے کمانڈرز و کارکنان بھی مارے گئے اور عوام بھی، اور ہزاروں لوگ زخمی بھی ہوئے۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ حزب اللہ کا کمیونیکیشن سسٹم تباہ کر کے اُسے زبردست شاک لگا دیا گیا۔ اِس صدمے سے ابھرنے سے پہلے ہی اسرائیل اپنی مہیب فضائی قوت کے ساتھ لبنان پر چڑھ دوڑا۔

ابتدائی دنوں سے ہی حزب اللہ نے جو جوابی اسٹریٹیجی اپنائی تھی وہ کامیاب رہی یعنی دشمن کے اقتصادی، انٹیلیجنس ٹھکانوں، اسلحہ خانوں اور فیکٹریوں کو نشانہ بنانا۔ اگر آئرن ڈوم کی زد سے بچ کر اُس کے تھوڑے سے بھی میزائل اور راکٹ نشانہ پر پہنچ جاتے ہیں تو اس سے اسرائیل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ غزہ ایک ساحلی اور سپاٹ ایریا ہے کھلے آسمان کے نیچے، جبکہ لبنان پہاڑوں سے گھرا ملک ہے۔ پہاڑی محل وقوع سے بھی حزب اللہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ شاید انہیں خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اسرائیل نے حزب اللہ کی پوری قیادت کو ختم کرنے کی پلاننگ کی تاکہ اُس کو پوری طرح مفلوج بنایا جاسکے۔ چنانچہ اسرائیل حزب اللہ کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دے رہا تھا بلکہ تابڑ توڑ فضائی بمباری کر کے اس نے حزب کے مزید کئی قائدین کو ہلاک کر دیا۔ ابتداء میں حزب اللہ کو گہرا شاک لگا مگر رفتہ رفتہ اب اس نے خود کو سنبھال لیا اور اسرائیل پر جوابی حملے شروع کر دیے۔

۲۶۔۲۷ ستمبر ۲۰۲۴ء کو منعقدہ نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں امریکی صدر نے پھر وہی اپنا گھسا پٹا موقف دہرایا کہ اسرائیل کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ حماس کا سات اکتوبر کا حملہ دہشت گردی تھا وغیرہ۔ انہوں نے اسرائیل اور حزب اللہ کے مابین ۲۱ دن کی عارضی جنگ بندی کا بھی اعلان کیا جسے مسترد کرنے میں اسرائیل نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ ترکی صدر رجب طیب اردغان اور اردن کے کنگ عبداللہ بن حسین نے بڑی زوردار تقریریں کیں اور اسرائیل اور اس کے مغربی اتحادیوں کے دوغلے پن کو صاف آشکارا کیا۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے بھی شاید پہلی بار صاف وصریح الفاظ میں اسرائیل پر شدید تنقید کی اور کہا کہ یہ ہماری سرزمین ہے اور ہم اس سے کہیں جانے والے نہیں۔ (لن نرحل لن نرحل)

جب اسرائیلی وزیراعظم نتن یاہو کو خطاب کے لیے بلایا گیا تو تمام عرب نمائندے اور ان کے ساتھ بہت سارے ممالک کے سفراء ہال سے واک آؤٹ کر گئے۔ آدھا ہال خالی ہو گیا، اس نے خالی کرسیوں کو ہی خطاب کیا۔ سفارتی سطح پر یہ اسرائیل کی بہت بڑی ناکامی ہے۔ آج دنیا کی رائے عامہ مغربی اور اسرائیلی میڈیا کے تمام تر غلط پروپیگنڈے کے باوجود اسرائیل اور امریکہ کا بیانیہ بک نہیں پا رہا ہے، اور پہلے مغربی دنیا کی رائے عامہ جو پوری طرح اپنے میڈیا کے ذریعہ گمراہ کی گئی تھی اب سرکاری نیریٹو کو قبول نہیں کر رہی ہے۔ اور نئی نسل سڑکوں اور کالجوں و یونیورسٹیوں میں اس کے خلاف نکل رہی ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ پوری طرح اسرائیل کی غلامی کر رہا ہے۔ نتن یاہو جب چاہتا ہے بائڈن اور اس کی انتظامیہ کو دھتکار دیتا ہے اور اُن کو بے عزت کر دیتا ہے۔ اِن امریکی چودھریوں کو اپنی ذلت کا بھی احساس نہیں۔ کئی مہینے پہلے صدر بائڈن نے اسرائیل اور حماس کے بیچ جنگ بندی کا ایک پروپوزل یہ کہ کر پیش کیا تھا کہ یہ اسرائیل کا تجویز کردہ

ہے۔ حماس نے اس کو تسلیم کر لیا مگر اسرائیل نے فوراً مسترد کر دیا۔ وہائٹ ہاؤس بجائے اس کے کہ اس پر ناراض ہوتا اُس کی لیپا پوتی میں لگ گیا۔ ہو یہ رہا ہے کہ اسرائیل کوئی بھی بیان یا تجویز دیتا ہے جو نتن یاہو کی خطہ کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے پروگرام میں مدد دے، تو امریکی خارجہ سیکریٹری اُس کا چورن بیچنے کے لیے دوڑیں لگا دیتا ہے۔

یورپ میں اسرائیلی جنگلی پن اور وحشیانہ اقدامات سے تشویش ہے مگر یورپ کے نوے فیصد ممالک اپنی سیکیوریٹی کے لیے امریکہ کے دست نگر ہیں، اس لیے اس کے خلاف جا نہیں سکتے۔

عرب ممالک، جو صحیح معنوں میں چند شیوخ کی جاگیریں ہیں، تمام کے تمام مل کر بھی اسرائیل کی مہیب فوجی طاقت کا اور خاص کر فضائی قوت کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ امریکہ ہر سال اسرائیل کو جدید ترین اسلحہ اور ٹیکنالوجی سے یوں لیس کر دیتا ہے کہ پڑوسیوں کے لیے وہ ناقابل تسخیر بنا رہے۔ عرب رجواڑوں نے منظر سے اپنے آپ کو بالکل غائب کر لیا ہے۔ کاش کہ وہ اندلس کے ملوک الطوائف سے ہی کچھ سبق سیکھ لیتے جن کو جنوب کی ایک عیسائی ریاست نے ایک ایک کر کے نگل لیا تھا۔ او آئی سی اور عرب لیگ کا کوئی کردار نہیں۔ سعودیوں نے جو اپنے حلیفوں کی اتحادی فوج بنائی تھی، جس کی قیادت راحیل شریف کو دی گئی تھی اُس کا کوئی بیان تک نہیں آتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ رجواڑے پولیس اسٹیٹ بنے ہوئے ہیں، ان کے پاس دشمن سے لڑنے اور اپنا دفاع کرنے کے لیے فوج نہیں ہے، بلکہ مخابرات (انٹیلی جنس) ہے جس کی تربیت امریکن سی آئی اے کرتی ہے۔ اور جس کا بہیمانہ استعمال داعیانِ دین کو ٹارچر کرنے اور مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

یو این کی سلامتی کونسل مفلوج ہو چکی ہے، تبھی تو وہ اپنی قرارداد (2735/2024) پر بھی اسرائیل سے عمل نہیں کروا سکی۔ یہ قرارداد بائنڈنگ تھی مگر امریکہ نے اس کو زبردستی نان بائنڈنگ قرار دے کر بے اثر کر دیا۔ آئی سی جے نے ایڈوائزری جاری کی کہ اسرائیل اپنی جارحیت فوراً بند کرے۔ مگر امریکہ نے سارے قواعد و ضوابط کو پامال کرتے ہوئے اس پر بھی عمل درامد نہیں ہونے دیا اور نتن یاہو کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ بھی ایشو نہیں ہونے دے رہا ہے۔

یو این سیکریٹری جنرل کو اسرائیلی نمائندے بار بار بے عزت کرتے ہیں۔ سلامتی کونسل کے ارکان کے سامنے اسرائیلی نمائندہ یو این چارٹر کو پھاڑ دیتا ہے۔ اب یو این سیکریٹری جنرل کو Persona non grata (ناپسندیدہ شخص) قرار دے کر اسرائیل میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

لبنان میں یو این کے جو سلامتی دستے تھے ان پر اسرائیل حملے کرتا ہے اور بنجمن نتن یاہو بڑے غرور سے کہتا ہے کہ یو این سیکریٹری جنرل کو اپنے دستوں کو وہاں سے نکال لینا چاہیے۔ اسرائیلی وزیر تعلیم کہتا ہے کہ لبنان کو بھی غزہ کی طرح ہموار کرنا ہے۔

اس منظر نامہ میں اسرائیل اب اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ اُس کو ہر طرح سے فری ہینڈ ملا ہوا ہے اور کوئی طاقت اُس کو روکنے والی نہیں ہے۔ یہی بات ای یو کے ایک اہم ذمہ دار جارج بوریل نے بھی کہی ہے۔ موقع کو سنہری جانتے ہوئے اب

اسرائیل اپنے گریٹر اسرائیل کے خواب کو پورا کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اخلاقی و معنوی سطح پر فلسطینیوں کو بتدریج کامیابی مل رہی ہے:

پہلے اُس کو اقوام متحدہ میں مستقل ممبر بنا لیا گیا اور آبزرور کی بجائے اس کو پرمانینٹ سیٹ دے دی گئی۔

دوسرے نمبر پر ے استمبر 2024 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس کو یہ فتح حاصل ہوئی کہ 120 ممبران کی اکثریت نے اُس قرارداد کو منظور کر لیا جس میں اسرائیل کو 1967 پر قبضہ کیے ہوئے علاقوں کو مقبوضہ تسلیم کیا گیا اور اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ ان علاقوں کو خالی کرے۔ اس کے لیے اس کو ایک سال کا وقت دیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اس قراداد کی مخالفت میں صرف چودہ ووٹ پڑے جبکہ 39 ممالک نے غیر حاضری درج کرائی۔ اور انڈیا بھی بے شرمی کے ساتھ انہیں غیر حاضر ملکوں میں رہا۔ انڈیا کا سرکاری میڈیا پوری طرح اسرائیل کی گود میں بیٹھا ہوا ہے اور اسی کے بیانیہ کو بے شرمی اور ڈھٹائی سے بیچ رہا ہے۔ بلکہ خفیہ طور پر اسرائیل کو ہتھیار بھی دیے جا رہے ہیں اور کئی ہزار مزدور بھی انڈیا نے اسرائیل بھیجے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ برہمن واد (ہندتو) اور صہیونیت دونوں نسل پرست تحریکیں ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی زبردست ہمدرد اور اسلام و مسلمانوں کی دشمنی میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس اور شرم کی بات یہ ہے کہ خود عرب ملکوں کا سرکاری میڈیا بھی مغربی بیانیہ کا ہی پرچار کر رہا ہے۔ صرف الجزیرہ نے غیر جانبدار رپورٹنگ اور صداقت کا ساتھ دینے کی ہمت دکھائی ہے اور اپنے بہت سارے صحافیوں کی قربانی دی ہے۔

بہرحال اقوام متحدہ کی مذکورہ بالا علامتی قرارداد کا کوئی عملی فائدہ ہو گا یا نہیں یہ تو وقت بتائے گا، بظاہر تو نہیں لگتا کہ ہو گا، تاہم اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی اکثریت فلسطین کے ساتھ ہے اور امریکہ و اسرائیل کو دنیا میں سیاسی تنہائی کا سامنا ہے۔ یہ بہرحال حقیقت ہے کہ یہ اکثریت کمزور ہے اور زیادہ تر تیسری دنیا یا ترقی پذیر ممالک سے تعلق رکھتی ہے، جن کو معاصر سیاسیات میں گلوبل ساؤتھ کہا جاتا ہے۔

اسرائیل اور اس کے اتحادی (یعنی گلوبل نارتھ) اپنی عسکری طاقت، ٹیکنالوجیکل برتری اور معاشی دھونس سے دنیا سے اپنی رِٹ منوا رہے ہیں۔ یہ مغربی دنیا اسرائیلی جارحیت سے یوں بھی ایکسپوز ہوئی ہے کہ حقوق انسانی کے جو ادارے انہوں نے بنائے، بنیادی انسانی آزادیوں کے جو تصورات دنیا کو دیے `اظہارِ خیال کی آزادی کا جو راگ صدیوں سے انہوں نے الاپا، اب خود ہی ان سب چیزوں کو اسرائیل کے لیے پامال کر رہے ہیں!

یہاں غالباً یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ شام کے بعض آزاد علاقوں میں اہل سنت نے شیخ حسن نصر اللہ کے مارے جانے کی خوشیاں منائیں اور سعودی عرب کے پیرول پر رہنے والے سنی دنیا کے بعض حلقوں سے ایسا ردعمل آیا جو نہیں آنا چاہیے تھا۔ خاص کر سلفی مدخلی رجحان رکھنے والے علما اور ان کے یوٹیوبرز کے تبصرے قابل افسوس ہیں۔ ایک مدخلی شیخ نے تو "نصر اللہ علیہ لعنۃ اللہ" کی نام سے ویڈیو بنا کر ڈالی۔ مدخلی سعودی عرب میں ایک متشدد سلفی فرقہ ہے جو ایک متشدد سعودی عالم ربیع بن ہادی مدخلی سے نسبت رکھتا ہے اور اپنے سوا سب کو، جن میں اشاعرہ ماتریدیہ بھی ہیں، بدعقیدہ اور

دوزخی سمجھتا ہے، برصغیر میں یہ اپنے آپ کو منہجی کہتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ حزب اللہ (جس کو مدخلی علما اور یوٹبرز حزب اللات کہتے ہیں اور نصر اللہ کو نصر اللات) اور دوسری شیعہ ملیشیاؤں نے شام میں اہلِ سنت کا بے دریغ خون بہایا ہے۔ شامی مظلوموں کی ایسے موقع پر خوشی منانا تو کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے، مگر بڑی بات یہ ہے کہ اہل سنت و اہل تشیع کے اختلافات اپنی جگہ، یہاں دیکھنا یہ چاہیے کہ مقابلہ ایسے بے رحم دشمن سے ہے جس کی ڈکشنری میں اخلاقیات کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں اور جو نہ شیعہ کو چھوڑتا ہے نہ سنی کو۔ سو اپنے گھر کے اختلافات بعد میں بھی حل ہوتے رہیں گے مگر کامن دشمن کے خلاف تو ایک مشترکہ محاذ بنانا چاہیے۔

جب سنی ممالک نے فلسطین کو پوری طرح بے یارومددگار اور اسرائیل و امریکہ جیسے سفاک دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے، اور ایران ہم مسلک نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی مدد کر رہا ہے تو ظاہری بات ہے کہ فلسطینیوں اور حماس والوں کا جھکاؤ ایران کی طرف ہونا ایک لازمی بات ہے۔ اصل قصور ان کا نہیں، خلیج کے بے غیرت حکمرانوں اور عرب منافقوں کا ہے! ایران کو کس بنیاد پر سنی مطعون کرتے ہیں! ان فریب خوردہ یوٹیوبرز کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اسرائیل نے حسن نصر اللہ کو اِس لیے نہیں مار دیا کہ انہوں نے شام میں سنیوں پر مظالم ڈھائے تھے اور اسرائیل نے ان کا بدلہ لے لیا ہے، نہیں بلکہ اسرائیل نے ان کو اس جرم میں مارا ہے کہ انہوں نے اہل غزہ کا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔

اتنی بڑی سنی دنیا کیا کر رہی ہے؟ ان کے علما اور یوٹیوبرز دجال کے خروج اور مہدی کے ظہور کے خیالی سراب کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں کہ مزعومہ مہدی آئے گا اور ان کے سارے دلدر دور کر دے گا! ان کو تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے کہ مہدی کا تصور تو اہل تشیع کے ہاں ان سے زیادہ قوی ہے مگر وہ صرف اس کے انتظار میں نہیں بیٹھے ہیں بلکہ دنیا میں اپنی بقا کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے وہ کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایران اس خطہ میں تسلط کے اپنے مفادات و مقاصد رکھتا ہے مگر ایران کے (اور اس طرح مزاحمتی قوتوں) کے دشمنوں سے ہاتھ ملانے سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ کے لیے تو خود کو مضبوط اور متحد کرنا ہوگا، ایران سے مفاہمت کرنی ہوگی اور بین المسالک ڈائلاگ سے کام لینا ہوگا۔

خلیجی ممالک کا غزہ کے پورے المیہ کے دوران جس طرح کا المناک، بے غیرتی اور بے حسی کا رویہ رہا ہے اُس سے عوام اور حکمرانوں کے بیچ صرف دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ کرایہ کے لمبے عماموں والے اور طویل اللحیہ شیوخ کے فتوے امریکہ کے ذلہ ربا حکمرانوں کو کب تک بچائیں گے؟ پوری تاریخ کیا کہتی ہے جب عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو بڑے بڑے جبابرہ گر جاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ عرب جاگیرداروں کو ایران کا خطرہ تو نظر آرہا ہے مگر وہ اسرائیل کے خطرے کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں، جبکہ اسرائیلی وزیر بن غفیر صاف صاف کہہ چکا ہے کہ ”ہمیں اب گریٹر اسرائیل بنانا ہے اور پانچ ممالک کو فتح کرنا ہے“۔ ان پانچ ممالک میں لبنان، سیریا، اردن، ترکی کا کچھ علاقہ سے لے کر سعودی عرب کا کچھ حصہ شامل ہے۔ ترکی صدر نے اسی خطرہ کو بھانپ کر کہا تھا کہ اسرائیل ترکی پر حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن ان کو سمجھنا چاہیے

کہ جب آپ صرف زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھیں گے تو دشمن کو فری ہینڈ تو آپ خود ہی دے رہے ہیں۔

اس خطہ میں جس ملک سے بھی اسرائیل کو کوئی موہوم سا بھی خطرہ ہو سکتا تھا اس کو امریکہ اور اس کے حلیفوں نے ختم کر کے رکھ دیا۔ عراق، لیبیا، شام سب کی یہی کہانی ہے۔ ترکی بھی اسرائیل اور بنجمن نتنیاہو کے خلاف زبانی اپنی بھڑاس نکالتا رہتا ہے مگر جیسے ہی امریکہ اور اس کے حلیف یہ محسوس کریں گے کہ وہ واقعی میں اسرائیل کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکتا ہے تو وہ اس کی بھی خبر لینے میں دیر نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں جبر و تشدد کے علمبردار اس نظامِ عالم کے، فی زمانہ جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے اور جس کو صہیونی قوتوں کا عالمی مقتدرہ ہینڈل کرتا ہے، کے خلاف مزاحمت ایک شرعی و عقلی اور انسانی فریضہ ہے۔ اور اس میں مذہب و مسلک کی محدود تنگ نائیوں سے نکل کر ہی یہ مزاحمت کی جا سکتی ہے۔

شیخ حسن نصر اللہ کی شہادت سے پورے خطہ پر ایک رنج والم کی کیفیت چھا گئی۔ مگر یہ خوف و ہراس کا ماحول عارضی رہا، حزب اللہ نے اپنا عبوری صدر نعیم قاسم کو مقرر کیا جنہوں نے ویڈیو بیان جاری کر کے بتایا کہ حزب اللہ کی دفاعی طاقت پوری محفوظ ہے اور قیادت کا بحران بھی جلد حل کر لیا جائے گا کیونکہ ان کے سسٹم میں سیکنڈ کمانڈ ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ ہاشم سیف الدین جن کو نصر اللہ کی جگہ لینی تھی کو بھی قتل کر دینے کا دعوا کیا گیا ہے۔ اسرائیل نے بیروت پر بھی حملے کیے ہیں اس لیے لبنان کی سرکاری فوج کو مزاحمت کرنی چاہیے اور لبنانی حکومت کو اور زیادہ فعال کردار ادا کرنا چاہیے، فی الحال تو وہ بھی مفلوج سی نظر آ رہی ہے اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی سی کنفیوزن والی حالت میں ہے، اپنے عوام کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہی ہے۔ محور المقاومہ یمن اور عراق سے برابر حملے کر رہا ہے جبکہ حزب اللہ نے بھی راکٹ داغنے جاری رکھے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حزب اللہ اپنے دفاعی کمانڈ کو مجتمع کر چکا ہے۔ اسرائیل کے زمینی حملوں کا مقابلہ کامیابی سے کیا جا رہا ہے۔

دوسری طرف حالانکہ اسرائیلی سماج اس وقت پوری قوت سے بنجمن نتنیاہو کے پیچھے کھڑا ہو گیا ہے مگر اسرائیل اب بہت سے لوگوں کے لیے محفوظ جگہ نہیں رہ گیا ہے، اس لیے ملک کو چھوڑ کر جانے والے اعلیٰ تعلیم یافتوں اور پیشہ وروں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جس کا اسرائیل کی معیشت پر جلد یا بدیر برا اثر پڑنا لازمی ہے۔

تجزیہ نگار نجم سیٹھی کا کہنا ہے کہ

”ایسا لگتا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل میں یہ طے پا گیا ہے کہ حزب اللہ کو نیوٹرلائز کر کے شام پر بھی حملے کیے جائیں۔ اور ایران اگر عوامی پریشر میں آ کر اسرائیل پر حملہ کرتا ہے تو اس کے خلاف بڑی کارروائی کرنے کا امریکہ اور اسرائیل کے پاس جواز ہو جائے گا۔ پھر وہ یا تو ایران میں Regime change کرنے کی کوشش کریں گے (جو کہ اب بھی کرتے رہتے ہیں) مگر ایران پر حملہ کی صورت میں وہاں یقینی طور پر تختہ پلٹ ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد اس خطہ سے مزاحمتی تحریکوں کو نیست و نابود کر کے فلسطینی مسئلہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا۔ غزہ کو برباد کر چکے، لبنان کا کچھ حصہ اور

شام کی گولان پہاڑیوں تک کو اسرائیل کے اندر ضم کر لیا جائے گا۔ جیسا کہ ٹرمپ کئی بار کہہ چکا ہے“۔

اور ایک عرب مبصر کا خیال ہے کہ:

”اس موقع پر نتن یاہو امریکہ کو اور اپنی پبلک کو یقین دلا چکا ہے کہ اسرائیلی فوجی طور پر جیت رہا ہے۔ لہٰذا اس کو لبنان میں فری ہینڈ دے دیا جائے اور امریکہ اسے یہ فری ہینڈ دے چکا ہے۔ باقی جنگ بندی وغیرہ کی باتیں محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہیں“۔

راقم السطور نے عرب میڈیا پر نظر رکھی ہوئی ہے اور اس کا بھی یہی خیال ہے کہ غزہ کو تباہ کر کے اب فی الحال اسرائیل جنوبی لبنان اور شام کے کچھ علاقے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ اور اس کے اتحادی اصل میں ایران کے نیوکلیر پروگرام کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اسرائیل ایران کو بار بار provoke کرتا آرہا ہے کہ وہ کوئی سخت ردعمل دے کہ اس کے خلاف جنگ چھیڑی جا سکے۔ ایسے میں ایران کچھ دنوں تک تو ایک مخمصہ میں پڑ گیا۔ ایک طرف اس کے عوام کا پریشر تھا کہ اسرائیلی جارحیت کا جواب دیا جائے، دوسری طرف اس کے لانگ ٹرم مقاصد اجازت نہیں دے رہے تھے کہ وہ جنگ میں شامل ہو جائے۔ کچھ نہ کرنے کے نتیجہ ہی میں اسرائیل تہران میں گھس کر اسماعیل ہنیہ کو شہید کرنے کی جرأت کر سکا۔ لیکن اب اُس نے عوامی مطالبات مانتے ہوئے جوابی حملہ کیا۔ ایک آپشن یہ بھی تھا جو زیادہ قرینِ قیاس لگتا تھا کہ ایران علی الفور حماس اور حزب اللہ کو جنگی مدد دے، اپنے تجربہ کار جنرل بیروت بھیجے اور اس طرح محور المقاومہ کو پھر سے اسرائیل کا شدید مد مقابل بنا دے۔ لیکن امریکہ اور اسرائیل دونوں ایران سے سیریا اور وہاں سے لبنان آنے والی سپلائی پر برابر فضائی حملے کر رہے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی اسرائیل نے سیریا میں روس کے ایئر بیس تک کو نشانہ بنایا۔ اس لیے جنگی مدد حزب اللہ کو دینا بہت آسان بھی نہیں ہے۔

اس جنگ میں اسرائیل کا ہارنا خود خلیج کے ممالک، فلسطین کے مستقبل اور لبنان و ایران سب کی بقا و تحفظ کا ضامن ہو گا۔ اس کی جیت سے امریکہ و اسرائیل پھر سے اس خطہ کا نقشہ بدل دیں گے۔ لیکن افسوس کہ خلیج کے چھوٹے بڑے اور ثروت مند ممالک سعودی عرب، امارات اور ان کے پچھ لگو مصر اور اردن بھی ایران، حزب اللہ اور حماس وغیرہ کی شکست میں اپنی فتح دیکھتے ہیں۔ وہ (در پردہ) اسرائیل کو فاتح دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لیے سعودی عرب کی قیادت میں فلسطینی مسئلہ کے حل کے لیے ایک شوپیس کی حیثیت کا بین الاقوامی محاذ بنانے کوشش کی جا رہی ہے جس میں یوروپی یونین کے بعض ممالک بھی ان کے ساتھ ہیں۔ یہ بلاک اس مسئلہ کے حل کے لیے مزاحمت کی قوتوں سے بالا ہی بالا ایک عالمی کانفرنس بلائے گا جس کا میزبان سعودی عرب ہو گا، اور اُس کے بعد کچھ عملی اقدامات کیے جائیں گے۔

اس بارے میں ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہو گا مگر خلیج کے عرب ممالک اب تک کے کردار کے مد نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مزاحمت کی قوتوں کو اس عمل سے پوری طرح باہر رکھ کر فلسطینی اتھارٹی سے سودے بازی ہو گی۔ غزہ اور مغربی کنارہ کا کچھ حصہ لے کر اس پر فلسطین کے قیام کا اعلان کیا جائے گا۔ القدس کی صورت حال جوں کی رکھنے کی کوشش ہو گی،

اور اس کے مشرق میں واقع ابودیس نامی ٹاؤن کو فلسطین کا ممکنہ دارالحکومت قرار دیا جائے گا۔ عرب ممالک خاص کر سعودی عرب غزہ کی بازآباکاری کریں گے (اگر اسرائیل اجازت دے گا)۔ مغربی کنارہ میں اسرائیلی سیٹلمنٹ برقرار رکھے جائیں گے کیونکہ اسرائیل سردست ایک انچ زمین بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مغربی کنارہ وہ ہرگز نہیں دے گا کیونکہ اس کو وہ قدیم اسرائیلی ریاست جوڈیا سمیریا کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ملینوں فلسطینی رفیوجیوں کو کچھ جاب یا پیسے دے دلا کر قصہ ختم کرنے کی کوشش ہوگی۔ اس مجوزہ آزاد فلسطین کی حیثیت ایک میونسپلٹی سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن سردست دنیا کی رائے عامہ کو بہلانے کے لیے اس طرح کا اقدام غالباً اٹھالیا جائے گا۔

لیکن یہ سب بھی اس وقت کی بات ہے جب اسرائیل اس پر کچھ لے دے کر معاملہ حل کرنے کے لیے تیار ہو۔ ابھی تو وہ تو دنیا کے سامنے جھوٹوں کو بھی ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا روادار نہیں ہے۔ اس لیے معلوم نہیں کہ خلیجی ممالک اور فلسطینی اتھارٹی کے لوگ کس سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور امریکہ اور یہ لوگ کس طرح دنیا میں دو ریاستی حل کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ البتہ یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ عرب ممالک سردست اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سعودی ولی عہد (اور اصل حکمراں) محمد بن سلمان کی امریکی خارجہ سیکریٹری سے بات چیت کی خفیہ آڈیو بھی جو لیک ہوگئی سوشل میڈیا پر گردش میں ہے جس میں وہ صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ وہ ’’فلسطینیوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے‘‘ (I don't care)۔

المبادرۃ الفلسطینیۃ (یا فلسطینی انیشیٹو) کے صدر مصطفیٰ البرغوثی یہی کہتے ہیں کہ ’’عرب ممالک اور فلسطینی اتھارٹی کے لوگ بڑی غلطی کر رہے جو امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ ان کا مسئلہ حل کرا دے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ اس نزاع میں پہلے ہی دن سے اسرائیل کی سائڈ پر ہے تو کیسے اس سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی پازیٹیو یا کسی منصف ثالث کا رول ادا کرے گا۔‘‘

جنگ باز اور عیار نتن یاہو نے اپنے حربی مقاصد میں بھی توسیع کرلی ہے۔ اب امریکہ کی بھرپور حمایت سے نتن یاہو کی یہ ہمت ہوگئی ہے کہ وہ صاف کہہ رہا ہے کہ اِس خطہ کو نئی shape دینی ہے۔ لبنان پر کیے گئے اپنے حملہ کو بھی اس نے آپریشن نیو آرڈر کا نام دیا ہے۔

تاہم اسرائیل پر ایران کے حملہ نے صورت حال کو کچھ بیلینس کیا۔ دو اکتوبر 2024 کو ایران نے دو سو ہائی سپر سونک میزائل اسرائیل پر داغے جس سے صورت حال میں تبدیلی آئی۔ گو ان حملوں میں اسرائیل کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا مگر اس کے بہت سے میزائل اہداف تک پہنچے جو جاسوسی کے نظام مراکز اور اسلحہ ڈپو، پلاننگ کے مراکز اور معاشی اہمیت کے حامل اداروں تک ہی محدود تھے۔ امریکہ اور اسرائیل دونوں کا دعوا ہے کہ انہوں نے تمام میزائل انٹرسیپٹ کر لیے تھے، مگر سابق امریکی انٹیلی جنس آفیسر اسکاٹ رٹر کا ماننا ہے کہ ایران کے میزائل اپنے اہداف تک پہنچے۔ اسرائیل میں وہ رات قیامت کی رات تھی جب پورے اسرائیل کے لوگ خوف و دہشت میں تھے۔ صہیونیوں کے لیے یہ خوف و

دہشت جانی نقصان سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس خوف و اضطراب سے اسرائیل کے شہری ناآشنا ہیں، وہ اب اسرائیل کو غیر محفوظ قرار دے کر امریکہ و یوروپ کی طرف بھاگنا شروع کر دیں گے، جو نفسیاتی اور اقتصادی بے چینی میں اضافہ کرے گا۔ ایران نے خبردار بھی کیا ہے کہ اگر اسرائیل نے جوابی حملوں کی کوشش کی تو اگلی بار ایران اسرائیل کے انفراسٹرکچر کو نشانہ بنائے گا۔ یہ تو یقینی ہے کہ اسرائیل خاموش تو نہیں بیٹھے گا اور اس کی امریکہ سے خفیہ بات ہو رہی ہے کہ اگلا نشانہ کس کو بنایا جائے۔

امریکی فوجی ائر کرافٹ کیریر بحری بیڑے ایران کے ساحلوں پر پہنچ گئے ہیں۔ امریکہ نے اپنا جدید ترین Thad سسٹم بھی اسرائیل میں ڈپلائے کر دیا ہے۔ اور دنیا کے سامنے یہ بیانات بھی متواتر دے رہا ہے کہ ہم جنگ کے دائرہ کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کیسی کوشش ہے کہ ایک Monster کو آپ سر سے پاؤں تک خطرناک ہتھیاروں سے لیس کرنے کے بعد گاؤں میں بھیج دیں اور پھر یہ امید لگائیں کہ وہ گاؤں پر حملہ نہیں کرے گا!

سولہ اکتوبر 2024 کو حماس کے سربراہ اور اسرائیل پر سات اکتوبر (2023) کے حملہ کی کامیاب پلاننگ کرنے والے یحیی السنوار بھی اسرائیلی فوجیوں سے شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس وقت وہ رفاہ کے تل السلطان ایریا میں تھے جب ان پر حملہ کیا گیا۔ یحیی ابراہیم حسن السنوار 29 اکتوبر 1962 کو غزہ کے خان یونس میں پیدا ہوئے تھے جو اس وقت مصر کے زیر انتظام تھا۔ سنوار کئی سال اسرائیلی جیل میں رہے، وہیں انہوں نے ہبرو (عبرانی) سیکھ لی تھی۔ وہ نہایت ذہین اور منصوبہ ساز تھے جن کی پلاننگ سے اسرائیل بھی خوف کھاتا تھا۔ اب ان کے بعد حماس کا سربراہ کون ہو گا، اس کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ ویسے حماس کے اب سب سے بڑے قائد خالد مشعل ہیں جو قطر میں قیام پذیر ہیں۔

امریکہ سے لیکر اسرائیل اور ان کے حلیفوں کے کیمپ میں سنوار کی شہادت پر خوشیاں منائی گئی ہیں اور بھارت کے برہمنی میڈیا نے بھی خوشی منائی، مگر ان بیچاروں کو معلوم نہیں کہ اسلامی روایت میں شہادت کی موت اعلیٰ درجہ کی موت سمجھی جاتی اور فلسطینیوں کے لیے تو یہ ایک فخر کی چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ حماس کے لوگوں نے اور فلسطین کے عام لوگوں نے بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ سنوار کی شہادت سے حماس کی مزاحمت کمزور نہیں ہوگی بلکہ اُس کو اس سے اور زیادہ طاقت ملے گی۔ بلکہ یو این او میں ایران کے مندوب نے بھی نہایت جرأت سے اسی بات کا اعادہ کیا۔

("دی نیشن" میں شائع ہونے والے مضمون کا اردو ترجمہ)

ایران نے اسرائیل کی جانب میزائل داغے ہیں کیونکہ وہ اسرائیل کی مسلسل مداخلت اور بڑھتی ہوئی دشمنی سے تنگ آچکا ہے جس کے بعد ایران اسرائیل پر اپنے حملوں کا وہی جواز پیش کر رہا ہے جو اسرائیل غزہ اور لبنان پر بمباری کے بعد پیش کرتا رہا ہے۔ اسرائیل نے جب بھی غزہ اور لبنان پر حملہ کیا ہے اس نے کہا ہے کہ ہم اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ ایران نے بھی اسرائیل پر بیلسٹک میزائل داغا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اس نے بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنے دفاع میں اسرائیل پر حملہ کیا۔ اسرائیل کے اپنے دفاع کے حق پر غور کیا جارہا ہے، لیکن ایران کے اپنے دفاع کے حق کو سراہا نہیں جا رہا ہے، بلکہ ایران پر دباؤ ڈالا جارہا ہے اور اسے سخت جوابی اقدامات کا عندیہ دیا جارہا ہے، جس پر ایرانی صدر کا کہنا ہے کہ اگر اسرائیل نے جوابی کارروائی کی کوشش کی، ایران کا ردعمل سخت اور طاقتور ہوگا۔

ایران نے اسرائیل کی بڑھتی ہوئی جارحیت اور ضرورت سے زیادہ مداخلت کے جواب میں اسرائیل پر حملہ کیا ہے، حالانکہ وہ تنازع کو تیز کرنے کی مخالفت کرتا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار خبردار کرتا ہے کہ اگر اسرائیل نے اشتعال انگیزی جاری رکھی تو ردعمل زیادہ شدید ہوگا، جس میں نہ صرف فوجی تنصیبات بلکہ اسرائیل کے بنیادی ڈھانچے کو بھی نشانہ بنایا جائے گا۔ جہاں اسرائیل ایرانی حملوں کے بعد سے اشتعال انگیز بیانات دے رہا ہے اور ایرانی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنانے کی دھمکیاں دے رہا ہے، وہیں یہ تشویش بڑھ رہی ہے کہ اگر اسرائیل کی جانب سے جوابی حملوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اگر اہم ایرانی تنصیبات کو نشانہ بنایا جاتا ہے، تو یہ کشیدگی مزید شدت اختیار کر جائے گی اور اس کے اتحادیوں کو نشانہ بنایا جائے گا۔ دونوں فریق براہ راست بھی اس جنگ میں شامل ہو سکتے ہیں تو ایسی صورت حال پرامن دنیا کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوگی۔

آٹھ دہائیوں کے بعد بھی دنیا ابھی تک عالمی جنگوں کی المناک یادوں سے نہیں نکلی ہے، اسے ایک نئے عالمی تناؤ کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اس عالمی تناؤ کا سوچنا ہی تشویشناک ہے۔ اس موڑ پر سپر پاورز کو زیادہ محتاط اور روک ٹوک اپنانے کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنے مقاصد کے لیے آگ پر مزید ایندھن ڈال رہی ہیں۔ وہ ایران کے خلاف اتحاد بنا رہے ہیں اور ایران کو سبق سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے حالات مزید خراب ہو رہے ہیں۔ اسرائیل کو غزہ جنگ کے بعد ہی روک دیا جاتا تو حالات اتنے کشیدہ نہ ہوتے لیکن عالمی طاقتوں کی غیر ضروری حمایت نے خطے کے امن کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے، اس دہشت گردی کی صورتحال سے دنیا کو صرف سپر پاورز ہی نکال سکتی ہیں۔ لیکن G7 ممالک اور ماتحت

اس سے گریز کر رہے ہیں۔

عالمی طاقتوں کو ایسی دوغلی پالیسی اپناتے ہوئے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر مشرق وسطیٰ میں کشیدگی کی آگ بھڑکتی ہے تو دنیا کا کوئی خطہ اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے گا۔ یہ خطہ مشرق و مغرب کا سنگم اور اہم بین الاقوامی بحری راستہ ہے، لہٰذا اس جنگ کے پھیلاؤ سے پوری دنیا میں تجارتی سرگرمیاں متاثر ہوں گی اور ترقی یافتہ ریاستوں کو متغیّر بحرانوں کا مقابلہ کرنا ہوگا، لہٰذا اس کو کم کرنا ضروری ہے۔ کشیدگی کو بڑھانے کے بجائے۔ عالمی سیاست کے تسلط پسند مفادات سے باہر نکل کر اسرائیل کی جاری جارحیت کو روکنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے اور اس غلطی کو بھی سدھارنے کی کوشش کی جائے جو یہ مغربی طاقتیں بہت پہلے مل کر کر چکی ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت رہی ہے کہ فلسطین میں صیہونی ریاست کے نام پر تباہی کا بیج دوسری جنگ عظیم کی فاتح مغربی طاقتوں نے مل کر بویا، حتیٰ کہ اس کی ناجائزیت کو اسرائیل کے بانی لیڈر ڈیوڈ بن گوریون نے بھی تسلیم کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ہم قابض ہیں اور فلسطینی اپنا دفاع کر رہے ہیں، لیکن ہمیں ماضی پر غور کرنے کے بجائے موجودہ حقائق پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ پوری دنیا سمیت پوری دنیا میں پائیدار امن کا عزم ہے۔ یروشلم دو ریاستی حل کے سوا کچھ نہیں۔

ایک آزاد فلسطینی ریاست کا قیام جس کا مرکز القدس ہو، مسئلہ فلسطین کا واحد قابل عمل اور قابل قبول حل ہے جس کے بغیر امن کا قیام ممکن نہیں۔ پوری دنیا کو امن کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ ان گنت بحرانوں میں گھری ہوئی ہے۔ تاہم، اب اسرائیل کے لیے ایران کے تیل کے منافع بخش شعبے کو نشانہ بنا کر اور دنیا میں اس کے بڑے اقتصادی وسائل کو تباہ کر کے جوابی کارروائی کرنا اس کے مقابلے میں آسان ہے کہ وہ ایرانی جوہری تنصیبات کے خلاف جوابی کارروائی کرے جو زیر زمین اور بظاہر محفوظ نظر آتی ہیں۔ لیکن اس سے غزہ، لبنان، شام اور اب ایران کے تنازعہ میں کئی گنا اضافہ ہی ہوگا، اس لیے اسرائیل کی طرف سے ایسی کوششوں سے گریز کرنے کی امریکہ کی تجویز سب کے حق میں ہے۔ اس کے لیے مسئلہ فلسطین کا منصفانہ حل بحران اور جنگ سے نمٹنے کی کلید ہے۔ عالمی طاقتوں کو اس تنازعے کے حل کی طرف قدم بڑھانا چاہیے اور ایران پر جوابی حملے سے گریز کرنا چاہیے، اگر اس مرحلے پر امریکا اور مغربی اقوام نے افہام و تفہیم سے کام نہ لیا تو تیسری عالمی جنگ کے افق پر ہے اور کوئی بھی اس سے بچ نہیں سکے گا۔

https://www.nation.com.pk/05-Oct-2024/world-war-iii-is-looming
5 October 2024

’ایک دن آئے گا جب ہماری سرحدیں لبنان سے لے کر سعودی عرب کے عظیم صحراؤں سے ہوتی ہوئی بحیرہ روم سے لے کر نہرِ فرات (عراق) تک پھیلی ہوں گی۔‘

رواں برس جنوری میں اسرائیلی مصنف ایوی لپکن کا یہ انٹرویو بہت وائرل رہا جس میں انھوں نے گریٹر اسرائیل کے تصور پر بات کرتے ہوئے کہا تھا ’فرات کے دوسری جانب کرد ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ ہمارے پیچھے بحیرہ روم ہے اور ہمارے آگے کرد۔۔۔ لبنان کو اسرائیل کے تحفظ کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم مکہ اور مدینہ اور طورِ سینا پر بھی قبضہ کریں گے اور ان جگہوں کو پاک کریں گے۔‘

اسرائیل کی جانب سے غزہ کے بعد لبنان میں بھی جاری کارروائیوں کے بعد سے سوشل میڈیا پر ایک بار پھر سے ’گریٹر اسرائیل‘ کے تصور کی گونج ہے۔

اس کی ایک وجہ غزہ میں زمینی کارروائی کے دوران کچھ سوشل میڈیا پوسٹس میں کیا گیا یہ دعویٰ بھی تھا کہ بعض اسرائیلی فوجیوں نے اپنے یونیفارم پر ’گریٹر اسرائیل‘ کے نقشے کا بیج پہن رکھا ہے جبکہ انتہائی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی وزرا کی جانب سے بھی ماضی میں اس تصور کا ذکر کیا جاتا رہا ہے۔

اس پر عرب ممالک کے صارفین کی طرف سے تشویش ظاہر کی گئی تھی کیونکہ ’دا پرومسڈ لینڈ‘ (وہ زمین جس کا وعدہ کیا گیا ہے) کے نقشے میں اردن، فلسطین، لبنان، شام، عراق اور مصر کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔

ہمسائیہ ممالک میں اسرائیلی کارروائیوں میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ چند ماہ کے دوران اس نے ایران، شام اور لبنان میں ٹارگٹڈ حملے بھی کیے ہیں اور اقوامِ متحدہ اور امریکہ سمیت دیگر مغربی ممالک کی جنگ بندی کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اسرائیلی کارروائیاں ہر گزرتے دن کے ساتھ بے باک ہوتی جا رہی ہیں۔

اسرائیل میں بہت سے یہودی اس خطے کو ’ایرٹز اسرائیل‘ یا ’لینڈ آف اسرائیل‘ کے نام سے جانتے ہیں اور یہ

اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے کہیں بڑا جغرافیائی علاقہ ہے۔

گریٹر اسرائیل کا تصور کوئی نیا خیال نہیں مگر یہ تصور کہاں سے آیا اور 'دا پرومسڈ لینڈ' میں کون کون سے علاقے شامل ہیں، یہ جاننے کے لیے ہمیں کئی سو سال پیچھے جانا پڑے گا۔

صیہونیت کے بانی تھیوڈور ہرزل کے مطابق 'پرومسڈ لینڈ' یا گریٹر اسرائیل کے نقشے میں مصر میں دریائے نیل سے لے کر عراق میں نہرِ فرات تک کے علاقے شامل ہیں یعنی فلسطین، لبنان، اردن، عراق، ایران، شام، مصر، ترکی اور سعودی عرب بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ ہوں گے۔

سنہ 1947 میں اقوام متحدہ نے فلسطین کو دو الگ الگ یہودی اور عرب ریاستوں میں تقسیم کرنے کی منظوری دی اور بیت المقدس کو ایک بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔

اس کے بعد اسرائیلی سیاستدان اور سابق وزیر اعظم مینیچم بیگن نے کہا تھا کہ 'فلسطین کی تقسیم غیر قانونی ہے۔ یروشلم ہمارا دارالحکومت تھا اور ہمیشہ رہے گا اور ایرٹز اسرائیل کی سرحدوں کو ہمیشہ کے لیے بحال کیا جائے گا۔'

اخبار ٹائمز آف اسرائیل میں 'زایونزم 2.0: تھیمز اینڈ پروپوزلز آف ریشیپنگ ورلڈ سیویلائزیشن' کے مصنف ایڈرئن سٹائن لکھتے ہیں کہ گریٹر اسرائیل کا مطلب مختلف گروہوں کے لیے مختلف ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اسرائیل میں اور ملک سے باہر رہنے والے یہودیوں کے لیے گریٹر اسرائیل کی اصطلاح کا مطلب مغربی کنارے (دریائے اردن) تک اسرائیل کی خود مختاری قائم کرنا ہے۔ اس میں بائبل میں درج یہودیہ، سامرہ اور ممکنہ طور پر وہ علاقے شامل ہیں جن پر 1948 کی جنگ کے بعد قبضہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس میں سینائی، شمالی اسرائیل اور گولان کی پہاڑیاں شامل ہیں۔

اس حوالے سے مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال پر گہری نظر رکھنے والی اور واشنگٹن میں مقیم پالیسی تجزیہ کار تقیٰ نصیرات کہتی ہیں کہ 'گریٹر اسرائیل کا تصور اسرائیلی معاشرے میں رچا بسا ہے اور حکومت سے لے کر فوج تک اسرائیلی معاشرے کے بہت سے عناصر اس کے علمبردار ہیں۔'

بی بی سی سے بات کرتے ہوئے تقیٰ نصیرات کا کہنا ہے کہ اسرائیلوں کا ماننا ہے کہ اسرائیل بائبل میں درج حوالوں اور تاریخ اعتبار سے ان زمینوں کا حقدار ہے جو نہ صرف 'دریا سے سمندر تک' بلکہ 'دریا سے دریا تک' پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی دریائے فرات سے دریائے نیل تک اور ان کے درمیان تمام علاقے۔

وہ کہتی ہیں کہ 'اگرچہ گریٹر اسرائیل کے تصور کے پیچھے اصل خیال یہی ہو سکتا ہے مگر آج کے اسرائیل میں ایک زیادہ حقیقت پسندانہ سوچ یہ ہے کہ اس میں اسرائیل کی سرحدوں سے باہر کے وہ علاقے بھی شامل ہیں جن پر اس نے طویل عرصے سے قبضہ کر رکھا ہے یعنی مغربی کنارے کے علاقے، غزہ اور گولان کی پہاڑیاں۔'

تاہم برطانیہ کی برمنگھم یونیورسٹی میں مشرق وسطیٰ کے امور کے ماہر اور 'کنگ فیصل سینٹر فار ریسرچ اینڈ اسلامک سٹڈیز'

سے منسلک ایسو سی ایٹ فیلو عمر کریم گریٹر اسرائیل کو 'محض ایک افسانوی تصور' مانتے ہیں۔

بی بی سی بات کرتے ہوئے عمر کریم نے بتایا کہ یہودی مذہب کے مطابق گریٹر اسرائیل سے مراد مشرقِ وسطی میں وہ تمام قدیمی علاقے ہیں جو سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے اور جہاں یہودی آباد تھے۔

وہ بتاتے ہیں کہ 'جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر آئے تھے تو اس وقت ان کا مرکز فلسطین تھا جہاں آ کر وہ آباد ہوئے' اسرائیلی حکومت اسے آج بھی جو دیہ صوبے کا حصہ مانتی ہے اور اس کے علاوہ گریٹر اسرائیل میں وہ تمام علاقے شامل ہیں جہاں جہاں یہودی آباد تھے۔

عمر کا ماننا ہے کہ گریٹر اسرائیل ایک ایسی فینٹیسی ہے جو پریکٹیکل نہیں 'مگر یہودیوں سے زیادہ صیہونی سیاست میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ 'عملی طور پر' اسرائیلی، فلسطین کے تمام مقبوضہ علاقوں سمیت مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کو اپنا حصہ مانتے ہیں لیکن اگر صرف 'فینٹیسی' کی بات کی جائے تو گریٹر اسرائیل میں جزیرہ نما عرب یعنی آج کے سعودی عرب، عراق، اردن، مصر کے کچھ علاقے اس میں شامل ہیں۔

'دا پرومسڈ لینڈ' کے متعلق عمر کریم بتاتے ہیں کہ جب حضرت یوسف کے دور میں یہودی مصر میں آباد ہوئے تب ان کی حکمرانی فلسطین سے لے کر بلادِ شام (آج کا شام) اور فرات کے کچھ علاقوں تک تھی اور عرب ریاستیں نہ ہونے کے باعث ان کا اثر و رسوخ کئی علاقوں تک تھا اور گریٹر اسرائیل کا تصور یہیں سے آیا ہے کہ 'بنی اسرائیل کی اولاد جہاں جہاں پلی بڑھی ہے وہ سب علاقے ہمارے ملک کا حصہ ہوں۔'

تاہم وہ کہتے ہیں کہ عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے اور اب گریٹر اسرائیل کا مطلب صرف مقبوضہ علاقے ہیں جن میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں سمیت مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ شامل ہیں۔

گریٹر اسرائیل پھر سے موضوعِ بحث کیوں ہے، کیا اسرائیل 'گریٹر اسرائیل' کے منصوبے پر کام کر رہا ہے؟

تقی نصیرات 2023 میں دائیں بازو کے اسرائیلی وزیر بیزلیل سموٹریچ کے پیش کردہ 'گریٹر اسرائیل' کے نقشے کا حوالہ دیتی ہیں جس میں اردن بھی شامل تھا اور جس کے باعث سفارتی تنازع کھڑا ہو گیا تھا۔

یاد رہے کہ اسرائیلی وزیر نے پیرس میں ایک تقریر کے دوران گریٹر اسرائیل کا ایک نقشہ پیش کیا تھا جس میں اردن اور مقبوضہ مغربی کنارے کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ اردن نے بیزلیل پر دونوں ممالک کے درمیان امن معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگاتے ہوئے شدید احتجاج کیا تھا۔

تقی نصیرات کہتی ہیں 'حقیقت یہ ہے کہ سموٹریچ ہو یا بین گویر، جن حلقوں کی وہ نمائندگی کرتے ہیں وہ اسی تصور کو اسرائیل کا جائز مستقبل سمجھتے ہیں۔'

وہ کہتی ہیں کہ انھوں نے اسی تصور کا استعمال کرتے ہوئے نیتن یاہو کی موجودہ حکومت میں غیر قانونی اسرائیلی آباد کاروں کو مسلح کرنے، ان کی حمایت اور تحفظ فراہم کر کے اسے حقیقت میں بدل دیا ہے۔

تقی کہتی ہیں کہ یہ غیر قانونی اسرائیلی آباد کار زبردستی فلسطینیوں کے زیتون کے باغوں کو جلا کر، انھیں ان کے گھروں سے بے گھر کر کے اور ڈرا دھمکا کر انھیں اپنی حفاظت کے لیے بھاگنے پر مجبور کر رہے ہیں اور مغربی کنارے میں نئی بستیاں قائم کر رہے ہیں۔

تقی نصیرات کا ماننا ہے کہ حماس کے اسرائیل پر کیے گئے 7 اکتوبر والے حملوں کے بعد ان عناصر (غیر قانونی مسلح اسرائیلی آباد کاروں) نے نمایاں اثر و رسوخ اور طاقت حاصل کر لی ہے اور وہ اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) اور نتن یاہو کے وزرا کی حفاظت میں اس ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ اکثر انھیں 'غیر ریاستی عناصر' پکارا جاتا ہے لیکن انھیں کچھ بھی پکار لیں، حقیقت یہی ہے کہ انھیں براہ راست وزیر اعظم نتن یاہو کی حمایت حاصل ہے جنھوں نے اس سال جولائی میں 5300 نئی بستیوں کے قیام کی منظوری دی تھی۔

تاہم عمر کریم کا ماننا ہے کہ 'کسی بھی قوم میں انتہا پسند ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں جیسے اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کی صیہونی افراد کے ہیں۔'

وہ کہتے ہیں کہ اسرائیل کی ریاست قائم ہونے کے بعد یہودیوں کو ایک مذہبی ریاست کا تصور دوبارہ سے ملا ہے کیونکہ پہلے یہودی جہاں بھی آباد تھے یا تو وہ اقلیت میں تھے یا ان ملکوں کے شہری تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ پہلی مرتبہ پاکستان کی طرح انھیں اسرائیل کی صورت میں ایک مذہبی ریاست کا تصور ملا ہے جہاں آپ کا مذہب ہی آپ کی قومیت کی بنیاد ہے اور 'یہیں سے اس بحث نے جنم لیا کہ چونکہ اب ہم نے اپنی مذہبی ریاست قائم کر لی ہے لہٰذا اب ہم اسے روایتی حدوں تک لے کر جائیں گے۔'

عمر کا کہنا ہے کہ آج کے اسرائیل میں بہت کم افراد 'جو انتہائی اقلیت میں ہیں' وہ ایسی باتیں کرتے ہیں تاہم ان کا ماننا ہے کہ عملی طور پر یہ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ اسرائیل کے اردن جیسے ہمسائیہ ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات ہیں جن کا مطلب ہے کہ وہ ان ممالک کی سرحدی حدود کو تسلیم کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ عرب امارت اور گلف کے ساتھ بھی اسرائیل کے سفارتی تعلقات قائم ہیں اور سعودی عرب کے ساتھ بھی ان کی خراب تعلقات نہیں۔۔ اور ملک کی تیسری جانب شام کے ساتھ بھی اسرائیل کا صرف گولان ہائٹس کا تنازع ہے اور اس کے علاوہ دونوں ممالک کے بیچ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

عمر کریم کا کہنا ہے کہ سیاسی اور عملی طور پر گریٹر اسرائیل کے قیام کی باتیں محض خیالی ہیں اور اسرائیل میں سنجیدہ سیاست دان اور تجزیہ کار اس بارے میں کبھی بات کرتے نظر نہیں آتے تاہم یہ فینٹسی ان طبقات میں ضرور موجود ہے جو ایک طرح سے پوری دنیا میں یہودیوں کی نشاتِ ثانیہ کا تصور رکھتے ہیں۔

اگر اسرائیل گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہے تو مغرب کا کیا ردِ عمل ہو گا؟

اگر اسرائیل گریٹر اسرائیل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہے تو مغرب کا اس پر کیا ردِ عمل ہو گا؟ اس حوالے سے تقیٰ نصیرات کہتی ہیں کہ اب تک مغرب، خاص طور پر امریکہ نے زمینی حقائق کی تبدیلی اور اسرائیلی بستیوں کی توسیع کے حوالے سے کمزور ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ اس سال کے شروع میں جب اسرائیل نے کچھ پر تشدد آباد کاروں کو بستیاں قائم کرنے کی منظوری دی تو 'بائیڈن انتظامیہ نے بہت نپے تلے انداز میں ان کی مذمت کی تھی۔'

تقیٰ نصیرات کا ماننا ہے کہ مغرب میں اسرائیل کے حمایتی ممالک کی طرف سے ان اقدامات پر کوئی سنگین ردِ عمل سامنے نہیں آیا لہٰذا ان کا ماننا ہے کہ 'ایک طرح سے مغربی ممالک کی جانب سے اسرائیل کو 'گریٹر اسرائیل' کے خواب کو پورا کرنے کے لیے گرین لائٹ مل گئی ہے' اور بااثر اسرائیلی لیڈروں کی ایک بڑی تعداد اس خواب کی تعبیر میں لگی ہے۔

تاہم اس حوالے سے عمر کریم کا کہنا ہے کہ گریٹر اسرائیل کا قیام نہ مغرب اور نہ مغرب میں رہنے والے یہودیوں کو قابلِ قبول ہو گا۔

وہ کہتے ہیں کہ جب 1947 میں یہودیوں کے لیے اس ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت یہی خیال تھا کہ پوری دنیا میں انھیں استحصال کا سامنا رہا ہے لہٰذا انھیں ایک الگ ملک ملنا چاہیے جہاں وہ اس طرح کے استحصال سے بچ کر زندگی گزار سکیں اور تمام مغربی ممالک اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں آج بھی مغربی کنارہ اور غزہ کو مقبوضہ علاقے کہا جاتا ہے اور اسے امریکہ اور برطانیہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ گریٹر اسرائیل کی بات تو ایک طرف ان مقبوضہ علاقوں کے علاوہ گولان ہائٹس جہاں اسرائیل 1967 سے قابض ہے، اسے بھی تمام مغربی ممالک اور بین الاقوامی ادارے مقبوضہ علاقہ مانتے ہیں۔

عمر کریم کا ماننا ہے کہ گریٹر اسرائیل کی نہ تو کوئی قانونی حیثیت ہے اور نہ اسرائیل کی پاس اتنی فوجی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے منصوبے کو مستقبل میں عملی جامہ پہنا سکے لیکن فرض کریں 'اگر اسرائیل ایسی کوئی کوشش کرنا بھی ہے تو مغرب کی سیاسی و فوجی اجازت اور مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔'

ان کا ماننا ہے یہ محض ایک فینٹیسی ہے جو مختلف شدت پسند گروہوں کے لیے 'سیاسی لائف لائن' کا کام کرتی ہے اور ان کے نظریات کو زندہ رکھنے میں اور ان کے لیے معاشرے میں اپنی اہمیت دکھانے میں کارگر ہوتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے پاکستان میں کچھ لوگ خلافت اور دنیا بھر پر راج کرنے کا تصور رکھتے ہیں۔

https://www.bbc.com/urdu/articles/clyv89v952xo
29 September 2024

(فلسطین اسرائیل تنازعہ کے حوالے سے روزنامہ جنگ کی
خبری سرخیاں اکتوبر ۲۰۲۳ء تا اکتوبر ۲۰۲۴ء)

اکتوبر 2023ء

غزہ کے واحد بجلی گھر کا ایندھن ختم، بجلی کی فراہمی مکمل منقطع — 11 اکتوبر

حماس سے جنگ اربوں ڈالر مہنگی پڑ جائے گی، اسرائیلی بینک کی وارننگ — 11 اکتوبر

اسرائیل فلسطین تنازع کے پھیلاؤ سے سنگین نتائج ہو سکتے ہیں، روسی صدر پیوٹن — 11 اکتوبر

امریکا اسرائیل۔ فلسطین کشیدگی کا پھیلاؤ نہیں چاہتا، مشیر قومی سلامتی — 11 اکتوبر

برطانوی و اسرائیلی وزیر فلسطینی حملے کا سائرن بجتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے — 11 اکتوبر

اسرائیل فلسطین تنازع، سلامتی کونسل کا اجلاس آج ہو گا — 12 اکتوبر

اسرائیل کو خبردار کیا تھا غزہ پھٹ پڑے گا، مصر — 12 اکتوبر

اسرائیل فلسطین تنازع کا 2 ریاستی حل نکالا جائے، چین — 12 اکتوبر

ایرانی صدر کا محمد بن سلمان سے پہلا ٹیلیفونک رابطہ — 12 اکتوبر

حماس کے حملوں میں ہلاک اسرائیلیوں کی تعداد 1300 ہو گئی — 12 اکتوبر

اسرائیل پر حماس کے حملے، 22 امریکیوں کی ہلاکت کی تصدیق — 12 اکتوبر

سعودی ولی عہد اور ترک صدر کی مسئلہ فلسطین پر گفتگو — 12 اکتوبر

......

نوٹ: طوالت کی وجہ سے مکمل تحریر صرف ”الشریعہ“ کی ویب سائیٹ پر شائع کی گئی ہے۔

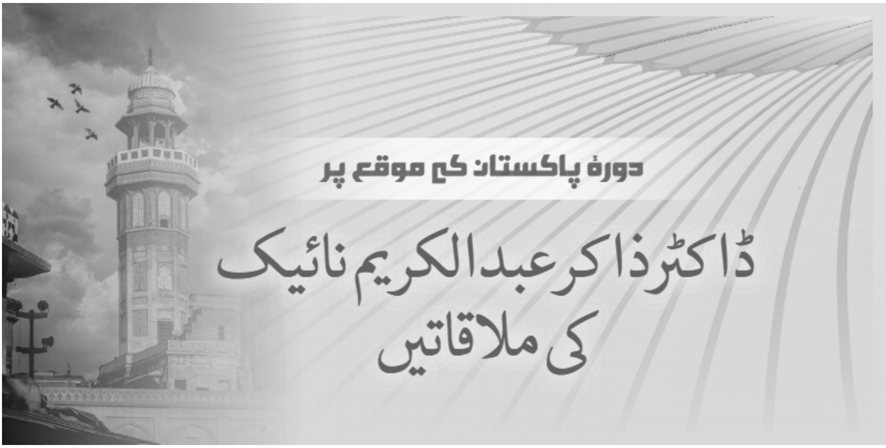

مولانا فضل الرحمٰن سے ملاقات

اسلام آباد (دنیا نیوز) ممتاز مذہبی سکالر ڈاکٹر ذاکر نائک نے جمعیت علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمان سے انکی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے ہمراہ ان کے صاحبزادے طارق نائیک بھی موجود تھے، مولانا فضل الرحمان نے اعلیٰ سطح وفد کے ہمراہ مذہبی اسکالر کا استقبال کیا، ڈاکٹر ذاکر نائیک نے مولانا فضل الرحمان کو پرفیوم کا تحفہ پیش کیا اور سربراہ جے یو آئی کی اقتداء میں نماز مغرب بھی ادا کی۔ مولانا فضل الرحمان نے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ آپ نے ہمارے گھر آکر ہمارے گھر کو رونق بخشی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی پاکستان تشریف آوری کو آپ کے مشن میں مزید برکت کا سبب بنائے۔ مولانا فضل الرحمان نے کہا کہ جس طریقے سے ڈاکٹر صاحب سوالات کا جواب دیتے ہیں وہ امت مسلمہ کی طرف سے دفاع ہوتا ہے، کئی لوگ ان کی دعوت سے ایمان کے نور سے منور ہوئے ہیں۔ مولانا فضل الرحمان نے کہا کہ عالم اسلام کے حسین چہرے سے دنیا کو روشناس کرانا اور امت مسلمہ کا اتحاد و اتفاق مشترکہ ہدف ہے، ڈاکٹر صاحب یہاں مہمان نہیں میزبان ہیں یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا کہ مولانا فضل الرحمان سے ملاقات میری خواہش تھی جو آج پوری ہوئی، کل کچھ دوست ملنے آئے لیکن میں نے کہا سب سے پہلے مولانا فضل الرحمان سے ملاقات کروں گا۔ اس موقع پر مولانا عبد الغفور حیدری، مولانا اسعد محمود، مولانا امجد خان، اسلم غوری، مولانا عبد الواسع، مولانا راشد سومرو، مولانا مصباح الدین، نور عالم خان، مولانا محمود شاہ، مفتی اویس عزیز، مفتی اسجد محمود و دیگر رہنما بھی موجود تھے۔ (دنیا نیوز، یکم اکتوبر ۲۰۲۴ء)

وزیر اعظم شہباز شریف سے ملاقات

اسلام آباد میں ہونے والی ملاقات میں وزیر اعظم نے پاکستان آمد پر ڈاکٹر ذاکر نائیک کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے دنیا بھر کو اسلام کے صحیح تشخص سے روشناس کروایا، امت مسلمہ آپ پر نازاں ہے، آپ اسلام کا صحیح پیغام لوگوں تک پہنچا کر ایک انتہائی اہم فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم نے ڈاکٹر ذاکر نائیک سے کہا کہ میں آپ کے لیکچرز بہت شوق سے سنتا ہوں، آپ کے لیکچر انتہائی پر مغز اور تاثیر سے بھرپور ہوتے ہیں، مجھے یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ آپ کا بیٹا بھی دین اسلام کی خدمت کر رہا ہے۔ وزیر اعظم شہباز شریف نے 2006ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک سے اپنی پہلی ملاقات کا بھی ذکر کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بھی کہا کہ پاکستان آکر میری بڑی خواہش پوری ہوگئی، پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا، میرا یہی مشن ہے کہ دنیا بھر میں اسلام کا پیغام عام کروں، اگر ہم اسلام کے راستے پر چلیں گے تو کامیاب ہوں گے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کا کہنا تھا کہ میں نے 1991ء میں پاکستان کا پہلا دورہ کیا تھا اور ابھی تک اس کی یادیں تازہ ہیں، میرا یہی مشن ہے کہ دنیا بھر میں اسلام کا پیغام عام کروں، اسلام آباد کے علاوہ کراچی اور لاہور میں بھی لیکچرز دوں گا۔ واضح رہے کہ ممتاز اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک 10 روزہ دورے پر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ (جیو نیوز، ۲ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

پارلیمنٹ ہاؤس کا دورہ

اسلام آباد (مانیٹرنگ ڈیسک، نیوز ایجنسیاں) ممتاز اسلامی اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے نیٹو طرز کے اتحاد کی تشکیل کی تجویز دے دی۔ اسلام آباد میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے فلسطین کی صورتحال پر مسلم دنیا کے اقدامات کے حوالے سے سوال پر ڈاکٹر ذاکر نائیک کا کہنا تھا کہ مسلمان ممالک کو نیٹو کی طرح کا اتحاد تشکیل دینا چاہیے۔ نیٹو کے 32 ممالک ہیں، اگر کسی ایک ملک پر حملہ ہو تو تمام ممالک پر حملہ تصور ہوتا ہے۔ ذاکر نائیک کا کہنا تھا کہ 57 اسلامی ممالک کو بھی نیٹو کے اصولوں پر مبنی ایک اتحاد تشکیل دینا چاہیے۔ اس طرح مسلمان ممالک زیادہ طاقتور ہوں گے، لیکن افسوس کے مسلمان تقسیم کا شکار ہیں۔ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس پر مزید جواب دیتے ہوئے ذاکر نائیک کا کہنا تھا کہ اس حوالے سے ہر مسلمان کم از کم دعا تو ضرور کر سکتا ہے اور اس کے لیے بہترین وقت تہجد کا ہے۔

علاوہ ازیں معروف اسلامی اسکالر مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا ہے کہ پاکستان کے لوگ بہت محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ بات اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق سے ملاقات کے دوران کہی۔ سپیکر ایاز صادق نے پارلیمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کا خیر مقدم کیا۔ ملاقات میں امتِ مسلمہ و درپیش چیلنجز، بین المذاہب ہم آہنگی سمیت دیگر امور پر گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا کہ امت مسلمہ کو اختلافات بھلا کر متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کا کہنا ہے کہ اسلام امن، محبت اور بھائی چارے کا دین ہے، میرے تبلیغی کام کا مقصد دنیا میں اسلام کے پیغام کو

اجاگر کرنا ہے۔ اس موقع پر اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق نے کہا کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے، اسلامی تعلیمات امن، رواداری اور محبت کا پیغام دیتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امت مسلمہ کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چلنے کی ضرورت ہے، آئین پاکستان میں تمام شہریوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ ایاز صادق کا کہنا ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو ان کے حقوق کا مکمل تحفظ حاصل ہے۔ اسپیکر قومی اسمبلی کے ہمراہ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے ایوان کا دورہ بھی کیا۔ واضح رہے کہ گزشتہ روز معروف اسلامی اسکالر مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک اسلام آباد پہنچے تھے۔ وزیر اعظم یوتھ پروگرام کے چیئرمین رانا مشہود اور ایڈیشنل سیکریٹری وزارتِ مذہبی امور عطا الرحمن نے ان کا استقبال کیا تھا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ذاکر نائیک آج (بدھ کو) کراچی کا دورہ کریں گے۔ اس سلسلے میں انتہائی سخت سکیورٹی انتظامات کئے گئے ہیں۔ پولیس حکام کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی سکیورٹی ایس ایس یو کے حوالے کر دی گئی ہے۔

آج 2 اکتوبر کی دوپہر کراچی ایئرپورٹ پر گورنر سندھ کامران ٹیسوری، وزیرِ اعلیٰ سندھ مراد علی شاہ اور میئر کراچی مرتضیٰ وہاب ڈاکٹر ذاکر نائیک کا استقبال کریں گے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک سے مفتی تقی عثمانی اور مفتی منیب الرحمن کی ملاقاتیں طے ہیں، اس کے علاوہ جامع الرشید کے سربراہ مفتی عبد الرحیم اور دیگر شخصیات بھی ڈاکٹر ذاکر نائیک سے ملاقاتیں کریں گے۔ 5 اکتوبر کو مزار قائد پر تقریب سے خطاب کریں گے جبکہ 7 سے 10 اکتوبر تک ان کی نجی ملاقاتیں طے ہیں۔ جس کے بعد 11 اکتوبر کی صبح ڈاکٹر ذاکر نائیک کراچی سے لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ (روزنامہ پاکستان، ۲ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

سینیٹر ساجد میر سے ملاقات

لاہور: (دنیا نیوز) عالم اسلام کے عظیم سکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک سینیٹر پروفیسر ساجد میر کی دعوت پر مرکز اہل حدیث 106 راوی روڈ پہنچ گئے۔ سینیٹر پروفیسر ساجد میر اور دیگر علما نے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا، ڈاکٹر ذاکر نائیک نے سینیٹر پروفیسر ساجد میر سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفاتر کا دورہ کیا، دورے کے دوران انہوں نے کہا کہ مجھے مرکز اہل حدیث آمد پر بہت مسرت ہو رہی ہے۔ پروفیسر ساجد میر نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کا شکریہ کہ انہوں ہمیں مہمان نوازی کا اعزاز بخشا، ڈاکٹر ذاکر نائیک کا دورہ پاکستان عوام خصوصاً دینی طبقات کے لیے خوش آئند ہے۔ اس موقع پر ناظم اعلیٰ حافظ عبد الکریم، قاری صہیب میر محمدی، رانا شفیق خان پسروری، ڈاکٹر عبد الغفور راشد، حافظ ابتسام الٰہی ظہیر، مولانا عبد الرشید حجازی، حافظ یونس آزاد، حافظ معتصم الٰہی ظہیر، حافظ محمد علی یزدانی، میاں منظور احمد موجود تھے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک اپنے دورے پر آج دوپہر کو لاہور پہنچے تھے، دورے کے دوران ان کی مسلم لیگ ن کے صدر نواز شریف اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب مریم نواز سے ملاقات کا بھی امکان ہے۔ گورنر پنجاب سلیم حیدر خان سے بھی ڈاکٹر ذاکر ملاقات کریں گے اور ان کا بیوروکریٹس سے بھی خطاب متوقع ہے۔ (دنیا نیوز، ۱۱ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

مولانا طارق جمیل سے ملاقات

لاہور (ڈیلی پاکستان آن لائن) معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک نے مولانا طارق جمیل سے ملاقات کی ہے۔

مولانا طارق جمیل کی رہائشگاہ پر ہونیوالی ملاقات کے دوران ذاکر نائیک نے کہا کہ پاکستان میں جو محبت ملی وہ بھارت سے کئی گنا زیادہ ہے، میری تمنا تھی کہ مولانا طارق جمیل سے ملاقات کروں۔ ان سے ملاقات تو پہلے مکہ میں ہو چکی تھی لیکن اپنے شہر میں ملنے کا لطف کچھ الگ ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانیوں کا جذبہ تو باہر دیگر ممالک میں دیکھ چکا ہوں لیکن جب پاکستان آیا تو ان کا جذبہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ مجھے لگتا ہے کہ پاکستانیوں کا پوٹینشل بہت ہائی ہے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا اور ہمیشہ پاکستانیوں سے امید رہتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا کہ پاکستان آکر دل بے حد خوش ہوا۔ پہلے جب انگریزی میں تقریر کرتا تھا سب سنتے تھے لیکن جب اردو میں تقریر شروع کی تو میرے خلاف باتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ میرا مقصد صرف ایک تھا کہ جو لوگ میرے خلاف باتیں کرتے تھے۔ میں انہیں بلاتا تھا اور چند ہفتوں یا مہینوں بعد وہ دوست بن جاتے تھے۔ اس موقع پر مولانا طارق جمیل نے کہا کہ اللہ نے جن صفات سے ڈاکٹر صاحب کو نوازا ہے، میں نے آج تک ان جیسی صفات نہیں دیکھیں۔ مولانا طارق جمیل نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اللہ کی خاطر ڈاکٹر کا پیشہ چھوڑا تو اللہ نے انہیں سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ڈاکٹر صاحب جو کام کر رہے ہیں ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے بیٹے کو مثلِ ذاکر نائیک بنائے۔ ہمیں ان جیسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ (روزنامہ پاکستان، لاہور ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

میاں محمد نواز شریف سے ملاقات

لاہور: پاکستان مسلم لیگ (ن) کے صدر میاں محمد نواز شریف سے معروف مذہبی اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک نے ملاقات کی ہے۔ ملاقات میں میاں نواز شریف نے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دینی خدمات کو سراہا۔ واضح رہے کہ معروف مذہبی اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک ان دنوں حکومت پاکستان کی دعوت پر پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اپنے دورے کے آغاز میں کراچی میں بڑے عوامی اجتماعات سے خطاب کیا جبکہ گزشتہ ہفتے انہوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں انہوں نے کہا کہ قرآن پاک ایک مکمل باضابطہ حیات ہے جو انسان کو اندھیروں سے روشنی میں لاتا ہے، یہ نور ہدایت اور باعث فلاح ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں قرآن پاک کی روشنی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (جیو نیوز، ۱۴ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

راؤ دلشاد: سابق وزیر اعظم نواز شریف سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی ملاقات ہوئی۔ ملاقات میں وزیر اعلیٰ مریم نواز بھی موجود تھیں۔ معروف مذہبی سکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک وزیر اعلیٰ ہاؤس پہنچ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز اور سربراہ مسلم لیگ (ن) نواز شریف سے ہوئی۔ نواز شریف اور مریم نواز نے ڈاکٹر ذاکر نائیک کو پاکستان آمد پر خوش آمدید کہا۔ (سٹی ۴۲، ۱۴ اکتوبر ۲۰۲۴ء)

بنو تمیم عرب کا مشہور قبیلہ تھا۔ اس کی مختلف شاخیں تھی اور یہ شاخیں عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پہلے مجوسی تھی لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا سب کچھ اسلام پر نچھاور کر دیا تھا۔ رسول اللہ نے ان کے بارے پیشین گوئی کی تھی کہ میری امت میں دجال کے مقابلے میں یہ لوگ سب سے زیادہ مخالف ثابت ہوں گے۔ یہ قبیلہ تجارت پیشہ تھا اور اسلام کی آمد سے قبل یہ لوگ برصغیر اور سری لنکا تک تجارتی سامان لے کر جاتے تھے۔ سراندیپ جسے آج کل سری لنکا کہا جاتا ہے وہاں کے راجہ کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ بنو تمیم بکثرت وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اسی قبیلے کی ایک خاتون جو تجارتی قافلے کے ساتھ سری لنکا سے واپس جا رہی تھی اس نے حجاج بن یوسف کو خط لکھا تھا اور راجہ داہر کے خلاف مدد کی درخواست کی تھی۔ حجاج بن یوسف کے حکم پر محمد بن قاسم ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ محمد بن قاسم نے صرف دو تین سال کی مدت میں پورے سندھ کو فتح کر لیا تھا اور وہ آگے بڑھتا ہوا ملتان تک جا پہنچا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کہ محمد بن قاسم کو آگے نہیں بڑھنے دیا گیا اور اسے واپس بلا کر شہید کر دیا گیا۔ اہل سندھ کو اس کی وفات کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف آنسو بہائے بلکہ اس کی یاد میں ایک شبیہ بھی بنا ڈالی۔

یہ محمد بن قاسم کا اہل ہند کے ساتھ حسن سلوک تھا کہ وہ ایک بیرونی حملہ آور کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے اس کی یاد میں شبیہ تک بنا ڈالی۔ ہندوستان میں جتنے بھی مسلم حکمران حملہ آور ہوئے سب نے یہاں کے عوام کے ساتھ حسن سلوک کے لازول اور انمٹ نقوش قائم کیے۔ اٹھارہویں صدی میں انگریز ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس نے یہاں کے عوام پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے وہ بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں صرف انگریزی عہد میں ہندوستان کا لٹریسی ریٹ بلندی سے پستی کی طرف آیا۔ اس کے برعکس مسلم سلاطین ہند نے اپنے عہد میں ہندوستان میں علوم و فنون کی جو شمعیں روشن کیں اس کے آثار آج بھی جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ محمود غزنوی، محمد غوری اور بابر جیسے تیغ زن اور جری سپہ سالار جب ہندوستان آئے تو ان کے ساتھ البیرونی جیسے محقق، حضرت ہجویری اور

خواجہ معین الدین چشتی جیسے علماء بھی تشریف لائے۔ محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک ہر عہد میں بیرون ہند سے علماء، فضلاء، صلحاء، شعرا اور اہل کمال بڑی تعداد میں ہندستان آئے اور انہوں نے اس ملک کو مستقل اپنا وطن بنا لیا۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے ارباب علم وفن کی بڑی قدر افزائی کی۔

مسلم سلاطین کی کوششوں سے جو ارباب علم وفن جو بیرون ہند سے آئے اپنے ساتھ علوم ومعارف کا خزانہ لے کر آئے۔ چنانچہ ان کے طفیل یہاں کا ادب، تمدن اور فکر کمال کو پہنچا۔ ذوق علم وتہذیب میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ آج تک اس کے نشانات سرزمین ہند پر ہر جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ شاہان ہند کی فیاضیوں اور قدردانیوں کا شہرہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی تھا، چنانچہ دنیا بھر سے بڑے بڑے علماء، فضلا اور شعراء بکثرت ہندوستان آتے اور شاہان ہند کی فیاضیوں سے مالامال ہوتے۔ اگر کوئی صاحب علم وفن کسی وجہ سے نہیں آسکتا تھا تو اپنی تصنیف یا اپنا کلام بادشاہ کے پاس بھیج دیتا اور وہیں بیٹھے بیٹھے صلہ پاتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کا انحطاط شروع ہوا، سلطنت کا دائرہ تنگ ہوا تو آمدن بھی کم ہوگئی لیکن شاہان مغلیہ کا علمی ذوق اور اہل علوم وفنون اور مدارس ومکاتب کی سرپرستی بدستور جاری رہی۔

یہی حال چھوٹی ریاستوں کا تھا مثلاً دکن کی ریاست حیدرآباد اور میسور کی ریاست نے انحطاط کے باوجود علم پروری کی روش کو نہیں چھوڑا تھا۔ ریاست میسور کا حکمران سلطان ٹیپو خود صاحب علم اور علم دوست تھا اور اس کی سلطنت میں تعلم وتعلم کا بہترین انتظام موجود تھا۔ مسلم سلاطین کے عہد میں مختلف مذاہب کا گہوارہ ہونے کے باوجود عوام کی اجتماعی زندگی مذہبی تعصب سے پاک تھی۔ مذہبی آزادی ہر ایک کو حاصل تھی۔ رعایا کے خانگی فیصلے ان کے مذہب اور رواج کے مطابق ہوتے تھے اور ان کو اپنی عبادت گاہیں بنانے اور ان میں عبادت کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔

میرے سامنے اس وقت ”سلاطین ہند کی دینی و مذہبی مساعی“ کتاب پڑی ہے جس میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی علم پروری، رعایا کے ساتھ حسن سلوک، اہل علم وفن کی قدردانی اور ان کی مذہبی مساعی کا جامع انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ساتھ کھلواڑ یہ ہوا ہے کہ یہاں جتنی بھی تاریخ کی کتب لکھی گئی وہ انگریز اور ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں، اور ان دونوں طبقہ ہائے فکر نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے تاریخی حقائق کو خلط ملط کیا اور اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں بابر اور اکبر کا ہندو رعایا کے ساتھ ظلم وستم تو دکھائی دیتا ہے لیکن بابر اور اکبر کی ہندوستانی رعایا کے ساتھ حسن سلوک کی مثالیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہمیں محمود غزنوی سے لے کر اورنگزیب تک مذہبی جبر تو دکھایا جاتا ہے لیکن سلاطین ہند کی انصاف پروری، رعایا کو حاصل مذہبی آزادی، معاشی مساوات اور حکومتی فنڈنگ سے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر ومرمت دکھائی نہیں دیتی۔

سلاطین ہند نے مذہب وملت سے قطع نظر اہل علم وفن کی جو قدر افزائی کی، انہیں انعامات سے نوازا اور ہندوستان کا لٹریسی ریٹ زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا اس پر کوئی بات نہیں کرتا۔ مذکورہ کتاب میں سلاطین ہند کی انہی مساعی کو

موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کتاب کی شروعات ہندوستان میں مسلم سلطنت کے قیام سے ہوتی ہیں اور اس کے بعد محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، عہد قطبی، التمش، رضیہ سلطانہ، ناصر الدین محمود، بلبن، خلجی، تغلق، لودھی اور مغلیہ سلطنت سمیت تمام سلاطین کے عہد پر بات کی گئی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے عہد کو بطور خاص موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ظہیر الدین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگزیب عالمگیر کے عہد کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی ہیں جو انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور عالیہ یونیورسٹی کولکتہ میں اسلامک تھیالوجی کے پروفیسر ہیں۔ فاضل مصنف اس سے قبل بھی مختلف موضوعات پر تحقیقی کتب تحریر کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں تحقیقی رجحان واضح ہے اور کتاب میں جابجا حوالہ جات موجود ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ شیخ زید اسلام سنٹر پنجاب یونیورسٹی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد عبد اللہ نے لکھا ہے اور اسے پاکستان میں القرطاس پبلشر نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عبد اللہ اور القرطاس دونوں نام معتبر ہیں اور ان ناموں کی موجودگی میں کتاب کی افادیت اور اس کا مطالعہ لازم ٹھہرتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اہم ہے اور خصوصاً ہندوستانی تاریخ سے شغف رکھنے والے اہلِ علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ یونیورسٹیز اور دینی مدارس کی لائبریریز میں اس کتاب کی موجودگی ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی اور ان لائبریریز کے لیے یہ کتاب بھرپور اعتماد کے ساتھ ریکمنڈ کی جا سکتی ہے۔

تاریخ کے لیے انگریزی میں لفظ History استعمال ہوا ہے۔[1] جس کے معانی ہیں: (۱) مہینے کا ایک دن، (۲) کسی چیز کے ظہور کا وقت، (۳) وہ کتاب جس میں بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کے حالات اور ان کے عہد کے واقعات درج ہوں، (۴) جملے، شعر یا فقرے، جن کے عدد نکالنے سے مادہ تاریخ نکل آئے (۵) روایات، قصے، افسانے (۶) جنگ نامے۔[2]

اردو میں تاریخ کے مترادف الفاظ توریخ، تواریخ، اخبار، تذکرہ، کتاب، روایت، داستان، دن، عہد، دور، مجموعہ، واقعہ، روزنامچہ، کہانی، خبر، خبریں اور علم سرگزشت وغیرہ ہیں۔ عام لغات میں تاریخ کے معنٰی ہیں "وقت بتانا" درج ہے۔ اصل میں تاریخ اور توریخ ایک ہی معنی دیتے ہیں۔

عربی زبان میں ارخت الکتاب بولا جاتا ہے یعنی کتابت کا وقت درج کرنا۔ عربی زبان میں نازل شدہ کتاب مقدس قرآن مجید میں لفظ تاریخ کے لیے بیسیوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً موقوتاً، قصص، دھر (زمانہ)، عصر اردو، واقعہ اور خود لفظ آیت بھی کئی معنی دیتا ہے۔

ترکی زبان میں لفظ History کو Torik کے نام سے رقم کیا گیا ہے۔[3] جرمن زبان میں History کے لیے لفظ Geschichte ادا ہوتا ہے جس کے معنی Ancient/Old history, event, story کے ہیں۔[4]

فرانسیسی زبان میں لفظ History لفظ History کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے معنی تاریخ و کہانی کے ہیں۔[5]

اٹھارہویں صدی عیسوی میں زمانے کی دیگر ترقیوں کے ساتھ ساتھ لفظ History نے بھی ترقی کی جانب قدم بڑھایا اور اسے Philosophy of History کہا جانے لگا۔

تاریخ کسی بھی نصاب تعلیم کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ سب سے منور، جگمگ کرنے والا، ذہنی و روحانی طور پر بصیرت

سے بہرہ ور کرنے والا علم ہے۔ ذہن و روح کی بھرپور فطری و قدرتی نشوونما میں معاون و موید و کارگر ہو، جو ذہن و جذبات میں اُبال پیدا کرنے کا موجب بنتا ہو۔ تاریخ کا مقصد ہونا چاہیے: زندگی کی تفہیم۔ ابتدائی ایام میں لوگ کس طرح سوچتے تھے، محسوس کرتے تھے، زندگی گزارتے تھے، ان کے افکار، محسوسات طرزِ زیست، سب کا مطالعہ تاریخ کا حصہ ہوتا ہے۔ تاریخ ایک ایسا علم ہے جو لوگوں کے دلوں میں ایک تعمیری تخیل اور طاقت و جذبات پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

مسلم تاریخ اس انداز سے پڑھائی جائے کہ مسلمان طالب علم اپنے علمی، سماجی، سیاسی ورثے تہذیبی و ثقافتی ورثے پر فخر کرنے والا بنے۔ اور وہ اپنے آپ کو ماضی کی اس شاندار تحریک کا ایک رُکن محسوس کرے۔ مسلمان حکام، امرا، سپہ سالاران، علماء، دانش وروں، معماروں، امرا یہ نہ صرف یہ کہ ان پر فخر کرے بلکہ ان جیسا بننے کی تڑپ اور لگن پیدا کرے۔

مسلمان نصف دنیا کے فاتح رہے ہیں۔ صرف ممالک و براعظموں کے نہیں بلکہ دلوں کے فاتح، کہ جن کو لوگ پوجنے پر مجبور ہو جائیں۔

ان کی مثالیں، اور نمونے تاریخ کا لازمی جزو ہونے چاہئیں۔ تاریخ کا علم ناپختہ ذہنوں کو پختگی عطا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ان کی ذہنی و روحانی تربیت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر نبی آخر الزمان ﷺ تک تاریخ مذاہب عالم میں کوئی مذہب بھی اپنی تاریخ کے لیے اس قدر عالم گیر، ہمہ گیر، جامع و منظم اور مکمل تاریخ ساز مواد کا خزانہ نہیں رکھتا، جس قدر تاریخ اسلام۔ دنیا کے بڑے مذاہب، یہودیت، نصرانیت، ہندومت اور بدھ مت کے مذہبی تاریخی حوادث و روایات میں توازن و اعتدال کی روح نمایاں طور پر کم پائی جاتی ہے۔ وہ آج تک اسلامی تاریخ نگاری کی تجزیاتی و تنقیدی، اجتہادی و استنباطی اور علمی و فکری جامع خصوصیات کے چیلنج کا جواب نہیں دے پائیں۔

تاریخ مذاہب عالم کامل نہیں ادھوری ہے کیوں کہ اس میں جزوی صداقت پائی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی تاریخ ہر اعتبار سے مکمل و حسین اور فطری ہے۔ اس کا تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ صدیوں تک مثالی سمجھا جاتا رہا اور اس نے علم و حکمت ادب و فن، صنعت و حرفت، ریاست و حکومت، قانون و سیاست، سیاحت و حرب، معاشیات و فقاہت، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں عظیم و باکمال اور نابغہ روزگار شخصیات پیدا کیں اور اُمتِ مسلمہ نے سات آٹھ صدیوں تک اقوام عالم کی قیادت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کو پھر قائم کر دیا جائے تو دنیا اسے پھر مثالی سمجھنے پر مجبور ہو جائے گی۔

ابن خلدون وہ پہلا شخص ہے، جس نے اس خاص نقطہ نظر کو پیش کیا ہے، جس کی رُو سے، تاریخ کو اسی حد تک کہ اس کی غائب حقائق کو جمع کرنا اور اس کی تنظیم و منہج ہے تاکہ ان کے ذریعے اسباب و تنازع کا انکشاف ہو سکے۔ ان کے نزدیک کسی تمدن میں جب کبھی خاص اسباب و علل کا اجتماع ہوتا ہے، تو اس وقت ایک معین حادثے کا ظہور ہوتا ہے۔

تاریخ کی غایت اجتماعیات یا حیاتِ اجتماعی کا مطالعہ ہے۔

تاریخ ایک دلچسپ علم ہی نہیں، دل چسپ مہم بھی ہے۔ گزشتہ قوموں کے اخلاق و احوال؛ انبیاء کی شریعتوں سے آگاہی؛ حکومت اور سیاست کے انداز، سلاطین کی پالیسی، حکمت عملی سے آگاہی؛ لڑائیوں اور حکومت کی خبروں؛ سابق صدیوں کے بیٹے ہوئے واقعات؛ حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان، سب کچھ تاریخ میں ملتا ہے۔ اسی طرح واقعات کی کیفیات و اسباب کا گہرا علم بھی تاریخ سے حاصل ہوتا ہے۔

بڑے بڑے مورخین اسلام نے مفصل تاریخیں لکھیں اور دنیا کے واقعات قلم بند کیے۔ اہم مسلم مورخین میں ابن اسحٰق، ابن جریر طبری، ابن کالبی، محمد بن عمر واقدی، مسعودی، یعقوبی، ابن کثیر، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے تاریخِ انبیاء سے لے کر اپنے عہد تک کے حکمرانوں کی مفصل اور متنوع تواریخ لکھ ڈالیں۔ جن میں اس عہد کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اصولِ حکمرانی، قواعدِ سیاست، طبیعتِ مدنیت، تمدن و معاشرت تک کے حالات لکھ ڈالے۔ انہوں نے صرف نقل پر اکتفانہ کیا بلکہ عقلی اور درایتی معیارات کو بھی بروئے کار لائے۔

برصغیر کی تاریخ پر لکھی گئی کتب کے تذکروں میں ابوریحان البیرونی (۱۰۴۸ء) کی "کتاب الہند" کا نمبر سب سے پہلے آئے گا۔

سردار امراو بہادر کی "بھارت پران" جسے ہندوستان کی قدیم تاریخوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ۵۷۱ صفحات پر مشتمل کتاب، ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ "بھارت پران"، ہندوستان کی پرانی تاریخ ہے۔ نیز مصنف نے رامائن اور مہابھارت کو بھی پرانے زمانے کے پرانے ہندوستان کی تاریخ کہا ہے۔ اور اس کے لئے انہوں عالمی ادب کے کئی بڑے لوگوں کا سہارا لیا ہے۔ بہرحال یہ کتاب قدیم ترین ہندوستان کی تاریخ ہے جس کو مختلف ابوابوں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان قدیم کو سمجھنے میں کسی حد تک معاون ہے۔

ضیاء الدین برنی (۱۳۵۷ء) کی "تاریخ فیروز شاہی "مملوک بادشاہ غیاث الدین بلبن کے دور ۱۲۶۵ء سے فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس ۱۳۵۷ء تک سلاطین دہلی کی پچانوے (۹۵) سال کی نہایت اہم تاریخ ہے۔

"منتخب اللباب"، خافی خاں نظام الملک کی تصنیف ہے جو ہندوستان کی عمومی کتب ہائے تواریخ میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کو تاریخ خافی خان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں سبکتگین سے لے کر لودھیوں تک کے مقامی شاہی خاندان شامل ہیں۔ جلد دوم میں تیموری خاندان اور مغل شہنشاہ اکبر تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جلد ۳ اکبر کی وفات کے بعد مغل دور (1605) پر محیط ہے۔ اس کتاب میں محمد شاہ کے دورِ حکومت کے 14 ویں سال یعنی 1732 کے آغاز تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

"ہندوستان کا شاندار ماضی"[6]، اے۔ ایل باشم کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کو غلام سمنانی صاحب نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی تہذیب و تمدن کی عکاس ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور تاریخ

کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ کوئی چیز محروم تشریح نہ رہ جائے۔ ہندوستان کی تہذیب، مذہب اور فن اہم ہیں۔ اس لیے بہر حال مختصراً ہی سہی ہندوستانی زندگی وفکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن نہایت ہی رنگارنگ اور خوبصورت ہے۔ اس لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ پیش نظر کتاب اسی رنگارنگ تہذیب وثقافت سے واقف کراتی اہمیت کی حامل ہے۔

"سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات" از خلیق احمد نظامی [7] اس موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ سلاطین دہلی کے عقائد ونظریات کیا تھے؟ اس پہلو پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر یوروپین مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کی تحریروں کی حقانیت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان سلاطین کی زندگی کے ماخذ زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔ اس کتاب میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان ابراہیم لودھی تک تمام سلاطین دہلی کے مذہبی افکار، نظام حکومت اور تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کی حیثیت پر مکمل بحث موجود ہے۔

"سلاطینِ دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت وشیفتگی کے جذبات" از صباح الدین عبدالرحمان [8] میں موضوع سے متعلق مواد کو علمی انداز میں عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

"مسلمان حکمران" از رشید اختر ندوی [9] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سے ٹیپو سلطان تک کے حکمرانوں کے احوال ووقائع کا ایک طویل تذکرہ ہے۔

صباح الدین عبدالرحمان کی کتاب "ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" [10] اپنے موضوع پر نہایت اہم کتاب ہے۔ مصنف نے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے متعدّد واقعات مستند حوالوں کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

مصنفِ موصوف کے دیگر کتب میں سے دو کتابیں: "ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے" اور "ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے" بھی موضوع سے متعلق اہم کتب سمجھی جاتی ہیں۔

ایشور ناتھ ٹوپا کی "ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول" [11] میں مصنف نے سلاطین اور مغل حکمرانوں کی سیاسی پالیسیوں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ محمد بن قاسم کی سیاسی پالیسیوں سے آغاز کر کے مغل حکمرانوں تک بشمول عہدِ سلطنت کے مختلف خاندان حکمرانوں کے ادوارِ حکومت میں رائج سیاسی نظام خصوصاً جزیہ جیسے مسائل کا اختصار سے جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ ان موجود تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے، جو برٹش حکومت کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ مصنف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی پالیسی سیاسی مصلحتوں سے اثرانداز ہوتی رہی ہے نہ کہ مذہبی اور تبلیغی جذبات سے۔

نندنی چٹرجی کی اس موضوع پر ایک اہم کتاب:

Negotiating Mughal Law: A Family of Landlords across Three Indian Empires[12]

ہے۔کتاب میں مصنفہ نے دیہی علاقوں سے میسر معلومات کی بنیاد پر مغل عہد کے مالیات اور ٹیکسوں کے نظام کا احاطہ کیا ہے۔کتاب سے اس غلط فہمی کی تصحیح ہوتی ہے کہ مسلم ادوارِ حکومت میں غیر مسلموں سے کوئی اضافی محصولات لیے جاتے تھے۔

محمد شفیع علوی کاکوروی کی کتاب "مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدر دانی"[13] میں مصنف نے ہندی تمدن و ثقافت کے نشو و ارتقاء میں مسلمان حکمرانوں کے جاندار کردار کو اجاگر کیا ہے۔ اس ضمن میں صوفیاء، علماء، جاگیر دار، گورنرز، اور دیگر طبقوں کے مثبت کردار کو نمایاں کیا ہے۔

"ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں"، اس عنوان سے سید سلیمان ندوی نے بہت عمدہ کتاب تحریر کی۔

ہندوستان میں مسلم حکومت

مغل سلطنت کا آغاز 1526ء میں ہوا جب اس کے بانی بابر نے پرانی دہلی سلطنت کے آخری خاندان کا تختہ الٹ دیا۔ وہ سیدھا وسطی ایشیا سے، سمرقند اور کابل سے نکلا تھا۔ پہلے پانچ شہنشاہ، وہ حکمران ہیں جن کے بارے میں مغل تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ ان میں سے آخری اورنگ زیب ہمیں 18ویں صدی کے اوائل میں لے جاتا ہے۔

اس کی موت کے بعد، 1707ء میں، سلطنت نے ایک صدی کے بتدریج زوال کا تجربہ کیا۔ برطانوی حکمرانی کے خلاف 1857ء کی عظیم بغاوت کے بعد جو 1858ء تک کئی طرح سے جاری رہی اور بالآخر اسے باضابطہ طور پر بجھا دیا گیا۔ اسی سال ملکہ وکٹوریہ نے مغل ریاست کو باقاعدہ طور پر تحلیل کر دیا اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا حصہ قرار دیا۔ لہذا، سرکاری طور پر، مغل سلطنت کی تاریخیں 1526ء سے 1858ء تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت کا شان دار دور تو 16ویں اور 17ویں صدی کے آخر میں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا دور ہی تھا۔ ان پانچ عظیم شہنشاہوں میں سے آخری عالمگیر کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

مختصراً، مغلوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ 'بادشاہوں کے بادشاہ' یا 'شہنشاہ' کے اس تصور کو قائم کیا جائے، جو کہ تعریف کے اعتبار سے ایک عظیم سلطنت ہے، نہ کہ محض ایک سلطنت۔ ان کے نیچے بہت سے ماتحت بادشاہ، یا 'راجے' تھے۔ ان کی بڑی کامیابیوں میں سے ایک راجستھان میں ہندو سلطنتوں کو اپنے سامراجی دائرے میں شامل کرنا تھا۔ اس طرح، ان کی سلطنت ایک عام "وسط ایشیائی سلطنت" نہ تھی، بلکہ ایک عظیم الشان سلطنت تھی، جو متنوع قسم کی تہذیبوں، اور ثقافتوں کے حاملین کو ایک نظام کے تحت لے آئے تھے اور بڑی خوبی سے ان کی صلاحیتوں کو ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف کر رہے تھے۔۔ پہلے سے موجود راجپوت ثقافت اور فن تعمیر کو اپنے درباری انداز میں ضم کرکے، وہ آہستہ آہستہ ایک ہندوستانی ریاست بن گئے۔

یہ ہندوستان میں انگریزوں کا حکومتی تجربے کا نتیجہ اس کے برعکس تھا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں، 17 ویں اور 18 ویں صدی کے ابتدائی سالوں میں، انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے، بنیادی طور پر، مقامی ملازموں کے ذریعے ہندوستانی ثقافت سے جڑنے اور آشنا ہونے کی کوشش کی۔ انگریز اپنی فطری نسل پرستی کی وجہ سے ہندوستان میں اپنی اس روش وعادت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچا نہ سکے۔

ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی دور کے دوران، برطانوی مورخین نے ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے بارے میں مقامی آبادی خصوصًا ان کی نئی نسلوں کو بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کچھ برطانوی مورخین نے دانستہ، بعض مذموم مقاصد کی انجام دہی کے لیے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی عدم برداشت، ہندو مندروں کی تباہی اور معاشی استحصال کی مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے مسلم حکمرانوں کا جابرانہ اور تباہ کن تصور پیش کیا۔ البتہ بعض انگریز مورخ ایسے بھی تھے جنہوں نے مسلم حکمرانی کے ثقافتی اور تعمیراتی ترقی کے اقدامات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا، جس میں مسلمان حکمرانوں کی طرف سے فن، ادب اور فن تعمیر میں مختلف تمدنوں کی شراکت تھی۔

برطانوی مورخین کے درمیان ایک عام موضوع مسلم حکمرانی کو ایک غیر ملکی تسلط کے طور پر پیش کرنا تھا، جس نے بقول ان کے مقامی ہندو معاشرے اور ثقافت کو درہم برہم کر دیا۔ اس نقطہ نظر کو دانستہ اور حکمتِ عملی کے تحت پھیلایا گیا، جس میں ایک مقصد یہ تھا کہ مسلم اشرافیہ اور ہندو اکثریتی آبادی کے درمیان اختلافات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دی جائے۔

جے ایس گریوال Grewal کی کتاب:

Muslim Rule in India: The Assessments of British Historians[14]

میں اس غیر متوازن تنقید و تجزیے کی متعدّد مثالیں موجود ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں مسلم حکمرانی پر برطانوی مورخین کے جائزوں پر بحث کرتی ہے۔

مسلم اہلِ علم، خصوصًا تاریخ سے شغف رکھنے والوں نے اس خطرناک منصوبے کو کسی حد تک سمجھا اور اس نوع کے لٹریچر کا جواب دینے کی کوشش کی۔

سر سید احمد خان[15]، علامہ شبلی نعمانی[16]، سید سلیمان ندوی،[17] معین الدین ندوی[18]، صباح الدین عبد الرحمان وغیرھم نے اپنے اپنے اسلوب میں مسلمان حکمرانوں کے بارے میں پھیلائی جانے والی ان غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصًا صباح الدین عبد الرحمان[19] نے اپنی کتب میں مثبت انداز میں مسلمان حکمرانوں کی ہندی تہذیب و ثقافت کی آبیاری میں ان کے جان دار کردار کو مستند حوالوں اور کثیر مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ ایک مقام پر فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ "مورخ کی نیت صحیح ہو تو موضوع کتنا متنازع فیہ ہو۔۔۔ اس کے روشن پہلو دکھانا کچھ مشکل کام نہیں، کون سی حکومت ہے جو بے داغ رہی ہے، لیکن اس کے صرف داغدار پہلوؤں کو پیش کیا جائے تو اس کے اچھے پہلو آسانی سے نظر انداز ہو جاتے ہیں"۔

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی نے دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی سے فاضل اور افتا (اسلامی فقہ میں تخصص) کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یوپی کے سنی تھیالوجی کے شعبہ سے ماسٹرز اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آئی سی سی آر، نئی دہلی کے زیر اہتمام اردو زبان میں بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ میں بطور محقق کام کیا۔ مئی ۲۰۱۲ء کو اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر شعبہ اسلامیات، عالیہ یونیورسٹی، کولکتہ، مغربی بنگال میں داخلہ لیا۔ جون ۲۰۱۴ء سے دسمبر ۲۰۱۵ء اور نومبر ۲۰۱۹ء سے دسمبر ۲۰۲۱ء تک شعبہ کے سربراہ کے طور پر کام کیا۔ ان کی چار عدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے دو غیر ملکی بین الاقوامی پبلشرز سے شائع ہوئی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی جرائد ورسائل میں لگ بھگ ڈیڑھ سو سے زائد مقالات اور تحقیقی مقالے شائع ہوئے۔ ۳۵ سے زائد قومی اور بین الاقوامی سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ کشمیر کی سنٹرل یونیورسٹی کے شعبہ تقابلی مذہب میں بورڈ آف سوشل سائنس میں سبجیکٹ ایکسپرٹ کے طور پر کام کیا۔ مغربی بنگال حکومت کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے بورڈ کے رکن اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے متعدّد جرائد کے مشاورتی بورڈ اور جائزہ کمیٹی کے رکن بھی۔ انہیں اسلامی فقہ اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے شعبوں میں خصوصی دلچسپی ہے۔

بحیثیت مورخ آپ تاریخی بصیرت اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے ساتھ امت مسلمہ کا درد رکھتے ہیں، آپ مسلمانوں کی یک جہتی اور یگانگت کے آرزومند ہیں، آپ تعمیری ذہن کے ساتھ مثبت اقدام کے حامی ہیں، آپ کا یہ رنگ زیرِ نظر تصنیف میں نظر آتا ہے، آپ کی نگاہ ہمیشہ ماضی کے روشن پہلوؤں پر رہتی ہے۔

زیرِ نظر تصنیف "سلاطینِ ہند کی دینی و مذہبی مساعی" میں مصنف نے ہندوستان میں مسلم سلطنت کے آغاز سے لے کر سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک، مسلمان حکمرانوں کے مختصر حالات اور ان کے مذہبی و سماجی کارناموں کی مختصر تفصیل دی ہے۔ کتاب کے مشمولات سے اس کے بیانات کے اسلوب اور تنوع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ہندوستان میں مسلم سلطنت کا قیام، محمود غزنوی کے حملے کا پس منظر، شہاب الدین غوری کی کامیابی، عہد قطبی کی دینی برکات، شمس الدین التتمش کی خدا ترسی، رضیہ سلطانہ کا حسن تدبر، پاک طینت ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن کا عہد زریں، جلال الدین خلجی کی دور اندیشی، علاؤالدین خلجی کی اقبال مندی، غیاث الدین تغلق کی دینداری، محمد شاہ تغلق کی فکری صالحیت، فیروز شاہ تغلق کی مساعی جلیلہ، سلطنت دہلی میں بگاڑ کے آثار، بہلول لودھی کی کسرِ نفسی، عہدِ سکندر لودھی کی دینی و علمی رونقیں، اولوالعزم فاتح ظہیر الدین محمد بابر، ہمایوں کی کشمکش اور نامرادی، اکبر کے متضاد رنگ، عہد جہانگیر میں مسلمانوں کی سربلندی، شاہجہان کی دین پروری، حامی اسلام اورنگزیب عالمگیر، اور سلطنت مغلیہ کا زوال۔ مصنف نے کتاب کو ابواب و فصول میں تقسیم نہیں کیا ہے بلکہ حکمرانوں کی زمانی ترتیب سے ان کے اسماء کو عنوان بنا کر ضروری تفصیلات ذکر کی ہیں۔

مذکور حکمرانوں کی انتظامی صلاحیت، رعایا پروری، بحرانوں سے نمٹنے، رفاہی کاموں سے دل چسپی، مذہبی رواداری اور تخلیقی روح جیسی صفات کو نمایاں طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ قائم کردہ عنوانات سے ہی ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر تصنیف میں وطن کی محبت اور مذہبی رواداری کے واقعات اور مظاہر کو تاریخ کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اپنے مثبت تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان حکمرانوں پر کیے گئے اعتراضات کو پس منظر میں رکھتے ہوئے مذکور حکمرانوں کی شخصی صفات اور ان کے ادوارِ حکومت کے سیاسی و انتظامی خدوخال کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ان اعتراضات کے تسلی بخش جوابات مل گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ مذکور کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زیر نظر کتاب اور اس کے مباحث کی اہمیت عصری تناظر میں مزید بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ ہندوستان میں مسلم صلاطین ہند کے ادوار کو ایک بار پھر تاریخی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے چھ دسمبر 1992ء میں ظہیر الدین بابر سے منسوب بابری مسجد کو یہ کہہ کر شہید کر دیا گیا کہ یہ شری رام چندر جی کی جنم بھومی ہے حالانکہ مصنف نے مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر متوفی 1530ء کا وہ مکتوب بھی درج کیا ہے جس میں وہ اپنے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان میں رعایا کے ساتھ رواداری اور ان کے مذہبی عقائد کے احترام کی نصیحت کر رہے ہیں اب اسی طرح کے خیالات کا اظہار درگاہ معین الدین چشتی اجمیری اور دیگر معروف مساجد کے حوالے سے بھی کیا جا رہا ہے یہ ایک خطرناک رجحان ہے جو سیکولر ہندوستان کو خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہوگا"۔ (ص ۱۱)

مصنف نے مسلمان حکمرانوں کے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ انصاف اور رواداری پر مبنی رویوں کی کئی مثالیں ذکر کی ہیں۔ اس ضمن میں بعض غیر مسلم مورخین جیسے ڈاکٹر تاراچند، ٹی ڈبلیو آرنلڈ، اور آر پی ترپاٹھی وغیرہ کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ مصنف کی اس نوع کی تحریریں ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ البتہ مذکور مصنفین کی کتب سے اصل اقتباسات نقل کرنا زیادہ مفید ہوتا۔ مزید برآں صباح الدین عبدالرحمان کی کتابوں میں مذکور عنوان پر قابلِ قدر مواد منتشر اجزاء میں موجود ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں جے ایس گریوال Grewal کی کتاب [20] میں بھی مفید اقتباسات موجود ہیں، جو شاید مصنف کی نظر سے نہیں گذری۔

اندازِ تحریر سادہ اور موثر ہے۔ ربط و ترتیب اور سلاست و روانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو پڑھنے والوں کو اس میں بیان کردہ موقف کا قائل کر دیتا ہے۔ کتاب یقیناً اردو ادب اور تاریخ مسلمانانِ ہند دونوں کی خدمت ہے۔

پاکستان کے ایک معروف اشاعتی ادارے "قرطاس" نے کتاب کو خوبصورت ٹائٹل اور معیاری اوراق پر شائع کیا ہے، جس پر ادارہ اور صاحبِ تصنیف دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کتاب عام قارئین، اور اساتذہ و طلبہ سے مزید خراجِ تحسین وصول کرے گی۔

حواشی

(1) Gem Student Dictionary, English to Urdu, p. 211

(2) فیروز اللغات، اردو جدید۔ لاہور، فیروز سنز۔

(3) The Oxford English Turkish Dictionary, p. 253

(4) Cassell's New German Dictionary, p. 191, 1963

(5) De Vries and Hochman, French English Dictionary, p. 250

(6) ناشر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، سنِ اشاعت: ۱۹۸۲ء، صفحات ۷۵۱

(7) مطبوعہ الجامعہ پریس دہلی، ۱۹۵۸ء، صفحات ۵۰۹

(8) اردو اکیڈیمی، لکھنو، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۴۶

(9) احسن برادرز، لاہور، ۱۹۵۷ء، ۸۳۰ صفحات

(10) مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء، صفحات ۲۰۴

(11) انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲، صفحات ۱۵۶

(12) Cambridge University Press, 2020

(13) سنٹرل لائبریری الہ آباد، ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۳۳

(14) Indian Branch, Oxford University Press, 1970 - India - 218 pag

(15) اس کی مثالیں سر سید احمد خان کی آثار الصنادید اور ان کے "مقالاتِ سر سید" مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(16) دیکھیے! کتاب "معارفِ شبلی" مرتبہ: ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ناشر قرطاس، کراچی۔ مولفِ موصوف نے علامہ شبلی کے تاریخ کے موضوع پر رسالہ "معارف" میں شائع شدہ مضامین کو مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: شبلی تاریخ کو ملّی تناظر میں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "المامون" کے مقدمے میں لکھا: "ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ و تیموریہ حکومت کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے، لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ بھی ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔" اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ کے کذب و افترا اور ان کی تاریخی غلطیوں کا ازالہ علامہ شبلی کی زندگی کا خاص مقصد اور مشن تھا۔ ان کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں ان کے پایہ

اعتبار و استناد کو پہلے ہی بیان کر دیتے ہیں۔ شبلی کے نزدیک مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں کی وجہ تعصب کے علاوہ یہ بھی تھی کہ وہ پرانے زمانے کا مقابلہ جدید دور سے کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک غلط اصول ہے، اور مؤرخانہ دیانت داری اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم ماضی کو صرف ماضی کے معیار سے دیکھیں اور "موجودہ طرزِ سلطنت سے ایشیائی حکومتوں کو نہ ناپیں۔" دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ بعض بادشاہوں کے ذاتی افعال کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ انفرادی افعال ہیں جو یورپ کے بادشاہوں سے بھی سرزد ہوتے رہے ہیں۔ ان کے لیے مذہب کو ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوسرے، شبلی کے نزدیک یورپ کی تاریخ میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ اگر کوئی ایسا موقع پیش آجاتا ہے تو ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات الگ کر لیے جاتے ہیں جو عقل کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ پھر ایک "کتاب" یا تاریخ بنالی جاتی ہے اور یہی اصولِ تصنیف ہے جو یورپ کی تصانیف کی بنیاد ہے۔

(17) سید سلیمان ندوی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے بہت اہم منصوبے رکھتے تھے، دارالمصنفین کے تحت اس موضوع پر مفید کام انہی کے ایما اور نگرانی میں ہوئے۔ سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی نعمانی کے قائم کردہ ادارہ "دارالمصنفین" کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ ملک میں اعلی مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرنا، علمی ادبی کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام کرنا، یہ سب دارالمصنفین کے بنیادی مقاصد تھے، یہ ادارہ اپنے مقاصد کی حصولیابی میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوا ہے۔

(18) دیکھیے، دارالمصنفین سے تاریخ کے موضوع پر ان کی شائع شدہ کتب۔

(19) سید صباح الدین عبدالرحمن ایک مشہور مؤرخ، قلمکار اور مفکر تھے۔ آپ کی زیادہ تر کتابیں ہندوستان میں عہد وسطی سے متعلق ہیں، تاریخ ہند پر آپ کی نگاہ بہت گہری تھی، آپ نے ہندوستان عہد وسطی کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا، اس لیے آپ نے اس دور کے بادشاہوں کی سیاسی، تمدنی، معاشرتی، فوجی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ان کی اکثر کتابیں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں درج ذیل شامل ہیں: زم تیموریہ، بزم مملوکیہ، بزم صوفیہ، ہندوستان عہد وسطی کی ایک جھلک، ہندوستان عہد وسطی کا فوجی نظام، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان کے سلاطین علماء مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، عہد مغلیہ، مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں، اور ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، وغیرہ۔

Muslim Rule in India: The Assessments of British Historians (20)

یادِ حیات (1)

خاندانی پس منظر / شیخینؒ کا تعلیمی سفر

ابو عمار زاہد الراشدی

ابن خلدون انسٹیٹیوٹ کی جانب سے طلال خان ناصر اور ہلال خان ناصر کا انٹرویو

(الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر کے فرزندانِ عزیز حافظ طلال خان ناصر اور حافظ ہلال خان ناصر کا انٹرویو مولانا راشدی کی نظر ثانی کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔)

السلام علیکم میرا نام طلال خان ناصر ہے، میں ایف سی کالج میں بی ایس فزکس کا سٹوڈنٹ ہوں اور میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائی موجود ہیں۔

السلام علیکم میرا نام ہلال خان ناصر ہے، میں بی ایس کمپیوٹر سائنس کا سٹوڈنٹ ہوں۔ آج ہمارے ساتھ ہمارے دادا جی ہیں۔ ہم بچپن سے ان کے واقعات اور ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں ان سے سنتے رہے ہیں اور ان کی مختلف تحریروں میں پڑھتے بھی رہے ہیں۔ ابھی ہم سوچا کہ ایک باقاعدہ ویڈیو ڈاکومنٹیشن کی جائے، جس میں ہم ترتیب سے ان حالات و واقعات کو سوال جواب کی شکل میں ان سے کلیئر کریں اور ان سے ہم سنیں تو اس کے لیے آج ہم پہلی نشست کا آغاز کریں گے، جس میں ہم ان سے ان کے خاندانی پس منظر کے بارے میں پوچھیں گے۔

سوال: دادا ابو! سب سے پہلے آپ سے ہم یہ پوچھیں گے کہ ہمارے نام کے ساتھ لگتا ہے سواتی، یہ ہمارے نام کے ساتھ کیسے آیا؟

جواب: بسم اللہ الرحمن الرحیم شکریہ بیٹا! ہزارہ کے مانسہرہ ضلع میں سواتی برادری کثیر تعداد میں آباد ہے، ہمارا تعلق اس سواتی برادری سے ہے۔ جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں سوات کی کسی گڑبڑ میں بہت سے خاندان منتقل ہو کر ہزارہ ضلع میں آ گئے تھے۔ اس وقت ہزارہ ضلع تھا۔ وہ آگے چلتے چلتے سواتی برادری کی شکل اختیار کر گئے۔ جیسے لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں کشمیری قوم ہے، ویسے ہزارہ میں سواتی قوم کہلاتی ہے۔ شنکیاری سے بٹگرام جاتے ہوئے راستے میں کڑمنگ ایک بستی ہے، اس کے ساتھ پہاڑی کی چوٹی پر ہمارے دادا محترم نور احمد خان مرحوم کا ڈیرہ تھا۔ وہ

چھوٹے موٹے زمیندار تھے تو ان کا زمیندارہ ڈیرہ تھا، جس کو چیڑاں ڈھکی کہتے ہیں۔ اس وقت تو ایک ڈیرہ سا تھا، جیسے زمینداروں کے ڈیرے ہوتے ہیں، لیکن اب بتاتے ہیں کہ وہاں خاصی آبادی ہے اور وہ گاؤں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ چیڑاں ڈھکی ہمارا اصل علاقہ ہے۔ ہمارے دادا کا نام نور احمد خان مرحوم ہے اور ان کے والد ہمارے پردادا جی کا نام گل احمد خان ہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ جناب نور احمد خان صاحب کے بیٹے ہیں اور اس خاندان سے ہمارا تعلق ہے۔

سوال: بڑے ابا جی لوگ کتنے بہن بھائی ہیں؟

جواب: یہ دو بھائی تھے، ان کی دو بہنیں تھیں۔ ان کی بڑی بہن ہماری بڑی پھوپھی جان ابھی چند سال پہلے فوت ہوئی ہیں۔ بٹل کے قریب لمی گاؤں ہے، وہاں ان کا قیام ہوتا تھا، میں کئی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اب وہ انتقال فرما گئی ہیں، لیکن خاندان وہاں ہے اور ہماری چھوٹی پھوپھی گکھڑ آ گئی تھیں، ان کی شادی لاہور میں دولت خان مرحوم سے ہوئی۔ پہلے ہماری پھوپھی جان کا انتقال ہوا، پھر ہمارے پھوپھا دولت خان مرحوم کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور یہ دونوں بھائی تھے حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ۔

سوال: بڑے ابا جی اور صوفی صاحب کا تعلیمی سفر کہاں سے شروع ہوا؟

جواب: اصل میں ہوا یہ کہ ان کی والدہ محترمہ ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں تو دادا مرحوم نے نئی شادی کر لی تھی۔ نئی شادی پر جو مسائل خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ پیدا ہوئے تو پھر یہ دونوں بھائی اپنے مختلف رشتہ داروں کے گھروں میں لمی میں اور دوسرے مقامات پر رہے۔ یہ چھوٹے بچے تھے اور اپنی ہمشیرہ کے ہاں اور اپنی پھوپھی کے ہاں رہا کرتے تھے۔ اس دوران کسی اللہ والے نے ان کی رہنمائی کی، ان کو تعلیم کی طرف راغب کیا تو یہ دونوں پہلے، آلاں جگہ کا نام ہے، وہاں اور پھر بفہ میں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں آ گئے اور وہاں سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔

ہمارے دادا مرحوم زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، عام زمیندار تھے، لیکن ان کا سیدو شریف کی خانقاہ کے ساتھ حضرت خواجہ عبد الغفور اخوند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا تعلق تھا، ان کی وہ نسبت قائم تھی اور وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ مجھے اپنے خاندان کے کچھ بزرگوں نے بتایا کہ وہ دعا مانگا کرتے تھے اور اپنے پیر حضرت خواجہ صاحبؒ سے انہوں نے درخواست کی کہ میرے بیٹوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ پاک ان کو بڑا مولوی بنائے۔ میں نے یہ سنا تو کہا کہ ان کی دعا قبول ہو گئی۔

سوال: ان کا تعلیمی سفر وہاں مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مدرسے سے شروع ہوا تو انہوں نے درس نظامی دار العلوم دیوبند سے کیا تھا؟

جواب: نہیں! اس زمانے میں طلباء کا مزاج ہوتا تھا کہ ایک سال ایک مدرسے میں، دوسرے سال دوسرے

مدرسے میں، تیسرے سال تیسرے مدرسے میں گھومتے پھرتے رہتے تھے تو یہ دونوں بھائی وہاں سے چلتے چلاتے سیالکوٹ میں وڈالہ سندھواں میں رہے ہیں، خانیوال میں جہانیاں منڈی میں رہے ہیں اور پھر چلتے چلاتے انوار العلوم گوجرانوالہ میں آگئے۔ شیرانوالہ باغ کی جامع مسجد میں ۱۹۲۶ء سے مدرسہ انوارالعلوم قائم ہے۔ وہاں اپنے وقت کے بڑے عالم حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، انہوں نے ان دونوں کی سرپرستی فرمائی اور دونوں بھائیوں کے مین استاذ وہ تھے، جو اپنی نگرانی میں پڑھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ تشریف لایا کرتے تھے تو والد صاحب ہمیں فرماتے کہ یہ آپ کے دادا جی آئے ہیں۔ ہم دادا جی کہہ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور دعائیں لیتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالقدیر صاحبؒ چھچھ کے تھے اور آخری اوقات میں دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث رہے ہیں، ہم ان کی خدمت میں دارالعلوم جایا کرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں پنڈی گیا، واپس آیا تو والد صاحب پوچھتے تھے کہ دادا جی سے ملا تھا تو مجھے شرمندگی ہوتی تھی، چنانچہ پھر میں عمداً ان کے ہاں جایا کرتا تھا تاکہ والد صاحب پوچھیں گے تو میں کہہ سکوں گا کہ دادا جی سے ملا تھا۔ وہ ہمارے بڑے شفیق، دعاگو اور سرپرست بزرگ تھے۔

مدرسہ انوارالعلوم میں مولانا عبدالقدیر صاحبؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اسی طرح دونوں بھائیوں کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے شاگردوں میں سے تھے، وہ یہاں مرکزی مسجد میں خطیب بھی تھے اور مدرسہ کے مہتمم بھی تھے۔ یہاں ان کے یہ اساتذہ ہیں، جن سے انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ یہ دونوں بھائی یہاں سے دیوبند چلے گئے اور دیوبند میں انہوں نے دورہ حدیث کیا ہے۔ اس وقت وہاں شیخ الحدیث شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان سے انہوں نے بخاری شریف کا آغاز کیا۔ لیکن پھر ان کے استاذ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار ہوگئے تھے۔ آپؒ تحریک آزادی کے بڑے لیڈروں میں سے تھے، آزادی کی تحریک میں گرفتار ہو گئے تھے تو طلباء نے غصے میں آکر ہڑتال کر دی تھی، بائیکاٹ کر دیا تھا، خاصے ہنگامے ہوتے رہے، حتیٰ کہ تعلیم کچھ عرصہ بند ہوگئی۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے متفقہ بائیکاٹ، ہڑتال، جلسے جلوس کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی اس کمیٹی کے سربراہ والد محترمؒ تھے اور اس کی قیادت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے کی تھی، جو کہ اس وقت سرفراز سرحدی کہلاتے تھے۔ اس لیے مجھ سے اگر کوئی پوچھتا ہے کہ آپ کے اندر یہ تحریکی ذوق کہاں سے آیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ابا جی سے آیا ہے۔

والد محترمؒ اور چچا محترمؒ دونوں بھائی دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے رہے، دارالعلوم دیوبند میں چونکہ ہڑتال تھی تو اس سال امتحان نہیں ہو سکے تھے۔ طلباء طلباء ہوتے ہیں، انہوں نے ہڑتال، بائیکاٹ اور جلسے اور جلوس کیے، دارالعلوم دیوبند کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا تھا۔ والد صاحبؒ کہتے ہیں کہ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو جمعیت علماء ہند کے صدر تھے، وہ طلباء کو سمجھانے کے لیے دیوبند آئے۔ انہوں نے ہم طلباء کو بلایا

اور سمجھایا کہ بیٹا! ایسے نہیں کرو، ٹھیک ہے اپنا احتجاج کرو، تحریک اپنی جگہ پر، لیکن مدرسے کو نقصان نہیں ہونا چاہیے، مدرسے کے لیے نقصان کا باعث نہ بنو تو ہم نے ان کے کہنے پر وہ تحریک ختم کی اور واپس مدرسے میں پڑھنا شروع کیا، لیکن اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اس سال سالانہ امتحان نہیں ہو سکا تھا۔ سالانہ امتحان کے لیے والد صاحب اور چچا محترم کو اگلے سال ۱۹۴۲ء میں دوبارہ دیوبند جانا پڑا اور انہوں نے جا کر امتحان دیا اور سند حاصل کی۔ بعد میں جب ۱۹۸۰ء میں صد سالہ اجتماع کے موقع پر حضرات شیخینؒ اور میں ہم تینوں دیوبند گئے تو انہوں نے مجھے وہ ٹھکانے دکھائے کہ یہاں ہم رہتے تھے، یہ کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں ان کے ساتھ میں بھی گیا تھا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر بتاؤں گا۔

سوال: دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ان کا گکھڑ کیسے آنا ہوا؟

جواب: جس زمانے میں یہ انوار العلوم میں تھے تو طلبہ ادھر ادھر جاتے رہتے ہیں تو اس زمانے میں ان کا گکھڑ رابطہ تھا۔ چنانچہ جب واپس آئے تو گکھڑ کے لوگوں نے حضرت مولانا عبد الواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تقاضا کیا کہ ہمیں کوئی اچھا سا عالم دین دیں تو ان کے کہنے پر والد محترمؒ ۱۹۴۳ء میں گکھڑ چلے گئے۔ گکھڑ میں جی ٹی روڈ پر چھوٹی سی مسجد تھی، اب تو بڑی مسجد ہے، وہ بوہڑ والی مسجد کہلاتی تھی، وہاں امام اور خطیب کے طور پر گئے۔ اس کے سامنے بٹ دری فیکٹری جو اس وقت پرانی تھی، اب نئی بن گئی ہے، وہاں ایک چوبارہ تھا، ہماری رہائش وہاں تھی، میری پیدائش وہیں کی ہے۔

گکھڑ میں والد صاحبؒ کا مدرسہ بھی تھا۔ اس زمانے میں مدرسہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ کو کسی عالم دین کی کسی فن میں شہرت کا علم ہوتا تو اس کے پاس اکٹھے ہوتے تھے، کسی کی تفسیر میں مہارت ہے، کسی کی حدیث میں ہے، کسی کی میراث میں ہے۔ طلبہ ماہر فن کے پاس اکٹھے ہو جاتے تھے، محلے کے لوگ روٹی کھلا دیتے تھے اور وہ مسجد میں سو جاتے تھے یہ اس زمانے میں مدرسہ ہوتا تھا۔ چونکہ حضرت والد صاحبؒ کی نحو میں شہرت تھی، نحو کے بہت ماہر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے تو باذوق طلبہ گکھڑ آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کا مدرسہ میں نے دیکھا ہے، اس کے بہت سے مناظر میرے سامنے ہیں۔ بیس پچیس طلبہ ہوتے تھے۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک والد صاحب اسی طرح پڑھاتے رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ والد صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ ایک دن میں کتنے سبق، کتنے پیریڈ پڑھا لیتے تھے تو فرمانے لگے کہ اکیس اکیس بائیس بائیس سبق تو پڑھائے ہیں۔ یہی کام تھا پڑھانا، نماز پڑھنا اور کھانا، سونا، اور کوئی کام نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے میں اکیس اکیس سبق پڑھائے ہیں۔

فراغت کے بعد والد صاحب گکھڑ آ گئے تھے اور حضرت صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد لکھنؤ میں حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ادارہ دارالمبلغین لکھنو میں چلے گئے، جہاں اہل سنت کے عقائد کے حوالے سے تربیتی کورس ہوتا تھا، وہاں ان سے کورس کیا۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن طبیہ کالج میں چلے گئے جہاں انہوں نے باقاعدہ تین سال طب کی تعلیم حاصل کی اور مستند حکیم حاذق تھے۔ پھر ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ گوجرانوالہ واپس آئے

اور یہاں سیٹ ہوئے۔

سوال: ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ایک ٹائم تھا کہ صوفی صاحب اور ابا جی آپس میں بچھڑ گئے تھے۔

جواب: یہ واقعہ تعلیمی دور کا ہے۔ بھائی تھے، کسی بات پر صوفی صاحب ناراض ہو گئے تو نکل گئے۔ والد صاحبؒ ان کو مختلف مدارس میں ڈھونڈتے رہے، بالآخر ایک جگہ مل گئے تھے تو پھر ساری زندگی اکٹھے رہے۔ دونوں بھائی ہی تھے، اس وقت کائنات میں ان کا اور تو کسی کے ساتھ رابطہ تھا ہی نہیں تو دونوں بھائیوں نے پھر اکٹھے ہی ساری زندگی گزاری ہے۔

سوال: صوفی صاحبؒ نے طب کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد انہوں نے طب پریکٹس کی یا نہیں؟

جواب: چوک نیائیں گوجرانوالہ میں انہوں نے دکان بنائی تھی، لیکن وہ نہیں چل سکی۔ اس میں کچھ مزاج کا دخل بھی تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کا مزاج بڑا نفیس تھا، لکھنوی مزاج تھا، لکھنوی مزاج گوجرانوالہ میں نہیں چلتا۔ والد صاحبؒ ایک دفعہ فرمانے لگے ہم یہاں سے دوائیاں گھوٹ گھوٹ کر بھیج دیتے ہیں، یہ وہاں دوستوں کو چائے پلاتا رہتا ہے۔ مریض آیا ہے تو اس کی بیماری دیکھو، اس کا علاج کرو۔ بہرحال ان کے مزاج کی وجہ سے دکان نہیں چل سکی، ورنہ حکیم بہت زبردست تھے، طبیہ کالج حیدرآباد دکن کے مستند حکیم تھے، لیکن اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ دکانداری کا مزاج بالکل مختلف ہوتا ہے۔

سوال: گکھڑ آنے کے بعد ان کا چیڑاں ڈھکی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کوئی تعلق؟

جواب: کہتے ہیں کہ طالب علمی کے دوران ہمارا پیچھے رابطہ نہیں تھا۔ جب گکھڑ آکر سیٹ ہو گئے تو پھر پیچھے رابطہ ہوا کہ کون ہے، کون نہیں ہے۔ ان کی سوتیلی والدہ حیات تھیں، ان کو والد صاحبؒ گکھڑ لے آئے، یہیں ان کی خدمت کرتے رہے۔ دادی مرحومہ کے بارے میں مجھے اتنا یاد ہے کہ گکھڑ میں ایک بوڑھی مائی ہمارے گھر میں ہوا کرتی تھیں، اس سے زیادہ یاد نہیں ہے۔ جب ذکر ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہاں وہ ہماری دادی تھیں، ان کا ہیولہ میرے سامنے ہے، میں تب دو چار سال کا بچہ تھا۔ یہیں ان کا انتقال ہوا، دادی جی مرحومہ کی قبر گکھڑ میں ہے۔ اسی طرح والد صاحبؒ چھوٹی ہمشیرہ کو لے آئے اور پھر وہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ میں نے جب ہوش سنبھالی ہے تو ہمارا آنا جانا تھا، آنا زیادہ تھا، ہمارا جانا کم تھا، لیکن بہرحال ہمارے رشتہ دار آیا کرتے تھے۔ لمی میں والد صاحبؒ کے پھوپھی زاد بھائی سید فتح علی شاہ صاحب تھے، والد صاحبؒ نے ابتدائی قاعدہ ان سے پڑھا تھا، وہ زیادہ آیا کرتے تھے۔ ایک والد صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے حاجی گوہر امان صاحب جو ہماری بڑی ہمشیرہ کے خسر بزرگوار تھے وہ بھی آیا کرتے تھے۔ پھوپھی زاد، خالہ زاد آنا شروع ہو گئے اور رابطہ بحال ہو گیا تھا، جو اب تک الحمد للہ بحال ہے۔

سوال: ہمارے بڑے ابا جی نے دو شادیاں کی تھیں تو ان کا سارا خاندان...

جواب: جب آپؒ گکھڑ میں سیٹ ہوئے ہیں تو دو سال کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ گوجرانوالہ میں تھانہ سیٹلائٹ

ٹاؤن کی بیک میں آبادی ہے، اس آبادی میں ایک مسجد کے امام مولانا محمد اکبر صاحب مرحوم تھے، جنجوعہ راجپوت برادری سے تعلق تھا، اچھے حافظ، اچھے قاری تھے تو مولانا عبد الواحد صاحبؒ کی وساطت سے والد صاحبؒ کی ان کے ہاں سے شادی ہوگئی۔ ہماری والدہ محترمہ مولوی محمد اکبر صاحب کی بیٹی ہیں اور گوجرانوالہ شہر کی ہیں۔ پہلی شادی ہوئی، اس سے ہماری بڑی ہمشیرہ پیدا ہوئیں، جن کا پچھلے سال انتقال ہوا ہے، اس کے بعد میں پیدا ہوا، میرے بعد ایک اور بھائی تھے جو بچپن میں ہی فوت ہو گئے، پھر مولانا عبد القدوس قارن صاحب، پھر مولانا عبد الحق صاحب اور جو جہلم میں ہماری چھوٹی ہمشیرہ ہیں، پیدا ہوئے۔ اس دوران حضرت والد صاحبؒ نے اپنی برادری میں بھی شادی کی۔ ہماری چھوٹی والدہ ان کی چچا زاد لگتی تھیں۔ حاجی فیروز خان مرحوم کورے اچھڑیاں میں ہوتے تھے، ان کی بیٹی تھیں۔ دوسری شادی ہوئی تو پھر دونوں گکھڑ میں اکٹھی رہیں۔ الحمد للہ ہمارا یہ امتیاز ہے کہ دونوں مائیں زندگی بھر اکٹھی رہی ہیں، ایک گھر میں رہی ہیں، ایک ہنڈیا رہی ہے، ایک جگہ کھانا رہا ہے جبکہ ہم بھائیوں میں بھی ہلکی پھلکی نوک جھونک چلتی رہی ہے، لیکن جس کو جھگڑا کہتے ہیں وہ کبھی نہیں ہوا۔ نہ ماؤں میں اور نہ ہم میں۔ ہم اکٹھے ہی رہے ہیں، اب بھی ہم سب بھائیوں کی طرح ہیں اور الحمد للہ ہمارے ہاں وہ ماحول نہیں پیدا ہوا۔

سوال: صوفی صاحب گوجرانوالہ آئے تو اس کے بعد ان کا کیا سلسلہ تھا؟

جواب: حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ان کے استاذ محترم تھے اور میں ان کی جگہ نائب کے طور پر آیا تھا۔ میں نے شیرانوالہ مسجد میں ان کی نیابت میں بارہ سال کام کیا ہے، وہ بڑی تفصیلات بتایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ شہر کی مغربی جانب گرجاکھی دروازے سے باہر سارا خالی علاقہ تھا، اکا دکا مکان ہوتے تھے، ہمارا مسلکی مرکز اس علاقے میں کوئی نہیں تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کہتے ہیں وہاں ایک بہت بڑا چھپڑ تھا۔ ہم نے کچھ دوستوں سے مشورہ کیا، چھپڑ پر قبضہ کر لیا اور چھپڑ کو بھرنا شروع کیا۔ حضرت صوفی صاحب کو حضرت مفتی عبد الواحدؒ صاحب نے وہاں بٹھایا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے دو تین کمرے تھے اور چھوٹی سی مسجد تھی، باقی سارا چھپڑ تھا۔ وہ مجھے یاد ہے، میں نے وہ سارا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا، بلکہ اس چھپڑ میں نہاتا بھی رہا ہوں۔ وہاں انہوں نے مسجد سے آغاز کیا، پھر اس مسجد کو باقاعدہ مسجد نور کا نام دیا گیا اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے آکر اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ سب حضرت صوفی صاحبؒ کا خلوص اور محنت تھی، ان کے ساتھ حضرت مولانا عبد القیوم صاحبؒ اور دوسرے رفقاء کی محنت تھی کہ مدرسہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا اور آج وہاں ایک ایکڑ جگہ ہے، جہاں جامعہ نصرۃ العلوم اور مسجد نور ہے۔

مجھے یاد ہے، جامعہ میں ایک دفعہ جلسہ ہوا تو حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ تشریف لائے، تقریر فرمائی۔ دو سال کے بعد پھر آئے تو ساتھ تین چار کمرے اور بن چکے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ہزارویؒ نے ایک جملہ کہا جو مجھے نہیں بھولتا۔ کہنے لگے مولوی کو کھڑا ہونے کی جگہ دے دو، لیٹنے کی خود بنائے گا۔ اب وہاں جامعہ نصرۃ العلوم کے نام سے الحمد للہ بہت بڑا جامعہ ہے جو کہ ایشیا کے ممتاز مدارس میں شمار ہوتا ہے۔

سوال: حضرت صوفی صاحبؒ کی شادی مدرسہ نصرۃ العلوم بننے سے پہلے ہوئی تھی یا...؟

جواب: حضرت صوفی صاحبؒ شادی کرتے ہی نہیں تھے۔ یہ بھی عجیب داستان چھیڑ دی ہے آپ لوگوں نے۔ ہمارے تین چار بزرگ تھے، جنہوں نے آپس میں عہد کر رکھا تھا کہ شادی نہیں کرنی۔ جن میں ایک ہری پور کے حضرت مولانا قاضی عزیز اللہ صاحب تھے اور ایک مولانا عزیز الرحمان صاحب تھے، جو صَرفی استاذ کہلاتے تھے، مجھے یاد ہے کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ شادی نہیں کرنی۔ حضرت صوفی صاحب تو بالکل نہیں مانتے تھے۔ انہیں شادی کے لیے آمادہ، قائل کرنے میں الحمد للہ ہمارا کردار ہے، سب سے زیادہ چھوٹی والدہ مرحومہ کا کہ کسی نہ کسی بہانے تنگ کرتی رہتی تھیں اور میں بھی جا کر کہتا چچا جی! چچی چاہیے۔ ان کی شادی ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء میں گکھڑ میں ہوئی ہے۔ اللہ کی قدرت کہ گکھڑ میں آرائیں برادری کے ایک بڑے سادہ سے بزرگ تھے، ان کے ہاں بات طے ہوئی، ہماری چچی مرحومہ والدہ مرحومہ کی شاگرد تھیں، ان کے ہاں پڑھتی رہی تھیں۔

سوال: آپ کتنے بہن بھائی تھے؟

جواب: ہم مجموعی طور پر بارہ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ ہمارے تین بھائی بچپن میں فوت ہو گئے تھے عبد الکریم رانا، عبد الرشید، اور ایک بھائی محمد یونس خان تھے جو بچپن میں فوت ہو گئے۔ ہم بارہ بھائی تھے، جن میں سے نو حیات رہے، جن کی شادیاں ہوئیں اور بہنیں تین تھیں، اب ایک فوت ہو گئی ہیں، دو الحمد للہ حیات ہیں، اللہ پاک سلامت رکھے۔ دونوں ماؤں سے ہم پندرہ بہن بھائی ہیں۔ سچی بات ہے کہ مجھ سے کوئی اب بھی پوچھتا ہے کہ اس ماں سے کتنے ہیں تو گننے پڑتے ہیں۔ الحمد للہ ہمارا سب کا بھائیوں بہنوں جیسا معاملہ ہے۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں ایک والدہ سے ہیں: میں، قارن صاحب، عبد الحق، ہماری بڑی ہمشیرہ اور جہلم والی ہمشیرہ۔ باقی بھائی اور چھوٹی ہمشیرہ جو گوجرانوالہ میں ہیں دوسری والدہ سے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے تقسیم کرنا مشکل ہوتا ہے، الحمد للہ سب کے ساتھ یکساں محبت پیار ہے۔

سوال: آپ کو سب لوگ مولانا زاہد الراشدی کے نام سے جانتے ہیں، لیکن آپ کا اصل نام کیا ہے؟

جواب: ہمارے ہاں نام کا سلسلہ یہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیری تھے، جو کہ حضرت والد صاحبؒ کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کا یہ ذوق تھا کہ حروف ابجد کے حساب سے نام رکھا کرتے تھے، یعنی اعداد نکال کر نام سیٹ کرتے تھے۔ میرا اصل پورا نام محمد عبد المتین خان زاہد ہے، اس کے لطائف بھی بڑے ہیں، لیکن محمد عبد المتین خان زاہد کے ابجد کے حساب سے اعداد نکالیں گے تو ۱۳۶۷ بنیں گے جو کہ ہجری اعتبار سے میرا سن پیدائش ہے۔ ہم سب بہنوں بھائیوں کے نام اسی طرح ہیں، آگے عمار اور عامر کے نام بھی اسی حساب سے ہیں کہ ان کے عدد نکالیں گا تو سن پیدائش نکل آئے گا۔ ماسٹر صاحب اعداد نکالا کرتے تھے، اس کے بعد یہ ذوق نہیں رہا تو اب ویسے چل رہے ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ میرا نام محمد عبد المتین خان زاہد لمبا نام ہے۔ میں نے جب لکھنا پڑھنا شروع کیا، لکھنے پڑھنے کا ذوق شروع سے چلا آ رہا ہے تو زاہد گکھڑوی کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ میرے بعض پرانے مضامین زاہد گکھڑوی کے نام سے

موجود ہیں۔ میرا بیعت کا تعلق شیرانوالہ لاہور حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ آپؒ میرے بڑے شیخ تھے، جن تین چار بزرگوں سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں۔ میرا شیرانوالہ آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن وہ فرمانے لگے کہ گکھڑوی ثقیل لفظ ہے کوئی ہلکا سا رکھو، تو میں نے کہا کہ پھر سلسلے سے منسوب کر لیتا ہوں۔ ہمارا سلسلہ کہلاتا ہے "عالیہ قادریہ راشدیہ" لطیفے کی بات یہ ہوئی کہ عالیہ سے علوی کی نسبت رکھنے والے ہمارے ساتھی مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب موجود تھے اور اکرام القادری صاحب بھی موجود تھے تو میں نے کہا کہ علوی بھی ہے، قادری بھی ہے، راشدی کوئی نہیں ہے میں راشدی بن جاتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا ٹھیک ہے۔ یہ غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے، تب سے میں زاہد الراشدی کے نام سے لکھ رہا ہوں اور اسی نام سے معروف ہوں۔

سوال: آپ نے ابھی بتایا کہ شروع سے ہی لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تھا تو آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن گھر سے ہی کیا؟

جواب: والدہ مرحومہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، ان کا گھر میں معمول تھا کہ شام کو بچیوں اور بچوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ہماری نانی مرحومہ کا بھی گوجرانوالہ میں یہ معمول تھا۔ گوجرانوالہ اپنی مسجد میں شام کو محلے کے بچے اور بچیاں آجاتے تھے تو ہماری نانی مرحومہ انہیں قرآن پاک پڑھایا کرتی تھیں، بہشتی زیور پڑھایا کرتی تھیں اور مجھے یاد ہے کہ "پکی روٹی" پڑھایا کرتی تھیں۔ یہ ٹھیٹھ پنجابی کا ایک رسالہ ہے، جو اس زمانے میں کورس میں شامل تھا۔ مثلاً اس میں تھا۔

جے کو پچھے توں بندہ کس داہیں؟ توں آکھ خدا تعالیٰ دا
جے کو پچھے اُمت کس دی ہیں؟ توں آکھ جی حضرت محمدؐ دی
جے کوئی پچھے تو ملت کس دی ہیں تو آکھ بابے ابراہیمؑ دی

نانی مرحومہ قرآن پاک کے ساتھ "پکی روٹی" اور دیگر اس قسم کے رسالے پڑھایا کرتی تھیں، ان کا یہ معمول تھا۔ وہی معمول والدہ مرحومہ کو منتقل ہوا تو گکھڑ میں مجھے یاد ہے کہ شام کو تقریباً عصر سے عشاء تک ہمارا گھر بچوں اور بچیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ والدہ مرحومہ قرآن پاک ناظرہ پڑھاتی تھیں، ترجمہ پڑھاتی تھیں اور بہشتی زیور پڑھاتی تھیں۔ میری والدہ مرحومہ خود حافظہ نہیں تھیں، لیکن بہت سی بچیوں نے ان سے حفظ بھی کیا ہے۔ بعد میں ہماری چھوٹی والدہ مرحومہ بھی ساتھ شامل ہوگئیں۔ ہماری دونوں مائیں پڑھایا کرتی تھیں، شام کو دو تین گھنٹے ہمارا گھر مدرسے میں بدل جاتا تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم تو وہاں سے حاصل کی، ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کچھ پڑھتا رہا۔ گکھڑ میں مسجد کے ساتھ ہی گورنمنٹ پرائمری سکول ہے، وہاں میں سکول میں داخل تھا۔ چوتھی جماعت تک اس اسکول میں پڑھا ہے۔

۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ راہوالی میں گتہ فیکٹری کے مالک سیٹھی محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے والد ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ نومسلم خاندان تھا، ان کا ذوق قرآن پاک ناظرہ اور حفظ کے مدرسے چلانے کا تھا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی گاؤں میں چلے جاتے اور اہل علاقہ سے کہتے کہ یہاں قرآن پاک پڑھانے والا قاری رکھیں، آدھی

تنخواہ میں دوں گا۔ مجھے وہ منظر یاد ہے کہ سیٹھی محمد یوسفؒ گکھڑ میں تشریف لائے، جمعے کے دن والد صاحبؒ سے کہا کہ مجھے خطبے سے پہلے دو چار منٹ بات کرنے کے لیے دیں گے؟ انہوں نے فرمایا کر لیں۔ سیٹھی صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ معروف لہجے میں قاری صاحبان کی طرح کوئی قرآن پاک کا ایک رکوع سنا دے تو میں اسے پچاس روپے انعام دوں گا، مگر شرط یہ لگائی کہ ہو گکھڑ کا۔ یہ ۱۹۵۷ء کے پچاس روپے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں نکلا جو معروف لہجے میں پڑھ سکے، کیونکہ اس زمانے میں معروف لہجہ قرأت کے ساتھ پڑھنا بہت کم تھا، سادہ دیہاتی لہجہ ہوتا تھا۔ انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر کے کہا کہ دیکھو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں قرآن پاک کی تعلیم کا مدرسہ بناؤ، قاری صاحب رکھو، آدھی تنخواہ میں دوں گا، آدھی تم اکٹھی کر لینا۔ یوں سیٹھی محمد یوسف صاحبؒ کی تحریک اور ان کے ساتھ اس معاہدے پر مدرسہ تجوید القرآن کے نام سے مدرسے کا آغاز ہوا۔ جہاں پہلے استاذ حضرت قاری اعزاز الحق امروہوی رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ امروہہ کے تھے، مہاجر تھے۔ انہوں نے وہاں پڑھانا شروع کیا تو میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، والد صاحب نے سکول سے اٹھایا اور مسجد میں بٹھا دیا، سکول اور مسجد کے درمیان میں دیوار ہی تھی، تب سے آج تک مسجد میں ہی ہوں الحمد للہ۔ قاری اعزاز الحق امروہویؒ سے قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھا، میرے ساتھ حفظ کی پوری کلاس تھی تو پھر وہاں سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو گیا۔

سوال: آپ نے بتایا کہ آپ کے گھر میں ہماری دادی امی کے پاس بچے اور بچیاں پڑھنے آتے تھے تو ان میں کوئی ایسے جو بعد میں مشہور ہوئے ہوں یا انہوں نے کام کیا ہو؟

جواب: الحمد للہ سابق صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ صاحب، سابق آئی جی پولیس احمد نسیم، فوج کے ایجوکیشن کور کے سابق انچارج بریگیڈیئر محمد علی چغتائی ہماری والدہ کے شاگرد ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں نے ان سے قرآن پاک پڑھا ہے اور الحمد للہ وہ اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔

دادا جی! آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنی دلچسپ باتیں اور اتنی قیمتی باتیں ہمارے ساتھ کی ہیں۔

اب ہم اس نشست کا اختتام کرتے ہیں۔ ہم نے اس نشست میں اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بات کی اور یہ کہ ہمارے بڑے ابا جی کیسے گکھڑ میں آ کر مقیم ہوئے۔ اگلی نشست میں ہم اپنے دادا جی سے ان کی تعلیم اور ان کے صحافتی سفر کے بارے میں گفتگو کریں گے، ان شاء اللہ۔

(جاری)

https://youtu.be/urNJoBmRVGk

According to a report published in Nawai Waqt on September 16, 2004, renowned legal expert MD Tahir has filed a writ petition with the Lahore High Court. The petition seeks a ban on love marriages and advocates for legislation discouraging elopement against parental consent. The aim is to protect parents from social stigma.

While Islam grants adult women the right to choose their spouses and prohibits forced marriages, the current legal framework regarding love marriages and elopements warrants review. The increasing number of girls fleeing their homes and marrying without parental consent, often followed by judicial approval, poses a threat to traditional family structures, just like the West.

While women should have the autonomy to make their own choices; elopement, hanging around without marriage, and subsequent marriage without parental involvement should not be encouraged. The Court must carefully consider this writ petition and issue a balanced judgment that aligns with Islamic values.

https://zahidrashdi.org/4705

متنوع دینی و ملّی موضوعات پر

مولانا ابو عمار زاہد الراشدی کی تحریرات

- قرآن / علومِ قرآن
- حدیث و سنت / علومِ حدیث
- فقہ / اصولِ فقہ
- سیرتِ نبویؐ
- سیرتِ انبیاءؑ
- صحابہؓ و اہلِ بیتؓ
- اسلام اور سیاست
- اسلام اور عدلیہ
- اسلام اور معیشت
- اسلام اور عصرِ حاضر
- دین اور معاشرہ
- دعوت و تبلیغ
- دین و حکمت
- علم و تحقیق
- تذکرہ بزرگانِ دین

- عالمِ اسلام
- تحریک و تنظیم
- مذاہبِ عالم
- مکاتبِ فکر
- مغرب اور سیکولرازم
- بین الاقوامی معاہدات و تعلقات
- انسانی حقوق
- عقائد و نظریات
- فکر و فلسفہ
- ہمسایہ ممالک
- دفاعِ و آزادی
- قومی سیاست
- قومی مسائل
- دستور / قانون / ادارے
- تاریخ و کردار

- دینی مدارس
- تعلیمی نظام و نصاب
- نقد و نظر
- اعزاز و انعام
- تربیت و اصلاح
- اسفار
- اجتماع / قرارداد / اعلامیہ
- مشاہدات و تاثرات
- شخصیات
- حالات و واقعات
- رفاہ و خدمت
- تعارف و تبصرہ
- سوالنامے / انٹرویوز
- ادبیات
- وفیات

---

www.ZahidRashdi.org